واما بنعمة ربك فحدث

اور اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو۔ (الضحیٰ)

نصف صدی سے زائد علمی، تحقیقی اور ادبی خدمات

کے اعتراف میں حضرت مولانا قاری پروفیسر ڈاکٹر

غلام مصطفےٰ خاں صاحب مدظلہٗ عالی

کی شان میں منعقدہ تین اعزازی تقریبات کا مجموعہ

نصائحِ مصطفوی

مرتبہ

سرفراز مصطفوی غفراللہ لہٗ

ناشر: ادارہ علمی مخزن

ایل۔۸۰۷۔۵۰۔سی/۴، نارتھ کراچی

جل جلاله

الله

بسم الله الرحمن الرحيم

وَاَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثۡ O (سورۃ الضحیٰ)

(اور اپنے رب کی نعمت کا خوب چرچا کرو)

نصف صدی سے زائد علمی، تحقیقی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں

اشرف المشایخ، استاذ الاساتذہ، وحید العصر

حضرت قاری مولانا پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب مدظلہ العالی

کی شان میں منعقدہ تین اعزازی تقریبات کا مجموعہ

نصائح مصطفوی

مرتبہ

سرفراز مصطفوی غفراللہ لہٗ

(بتعاون : شیخ صغیر احمد صاحب)

ناشر : اِدارہ علمی مخزن

ایل-۷۰۸، ۵-سی / ۴، نارتھ کراچی

نام کتاب ——— نصائح مصطفوی

مرتّبہ ——— سرفراز مصطفوی

طبع اول ——— ۱۴۱۷ھ / ۱۹۹۶ء

تعداد ——— ۳۰۰

کمپوزنگ ——— وِز کمپیوٹر۔ گلشن اقبال کراچی

4967759 - 465977

کمپوزر ——— اقبال اعظم اور صفدر اقبال

مطبوعہ ——— احمد برادرس، ناظم آباد نمبر ۲ کراچی

ناشر ——— ادارہ : علمی مخزن

ایل-۸۰۷، ۵-سی / ۴، نارتھ کراچی

644918

وحید العصر حضرت قاری مولانا پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہٗ العالیٰ

کی کتابیں ملنے کے پتے

(۱) المصطفیٰ مسجد : پرانی سندھ یونی ورسٹی، گاڑی کھاتہ، حیدر آباد

(۲) قیوم بک ڈپو : ۵۳-اردو بازار، کراچی فون 2631268

(۳) صغیر احمد : اے ۵۵ بلاک 1 فیڈرل بی ایریا کریم آباد کراچی فون 6330919

(۴) عبدالوحید : 92-H، قصبہ کالونی، کراچی فون 6691629

(۵) ادارہ علمی مخزن : ایل-۸۰۷، ۵ / ۴، نارتھ کراچی فون 644918

معنون

اپنی اس ناچیز سعی کو --------

سرحلقہ عشاق' اشرف المشائخ' خضرِ سالکان' استاذ الاساتذہ' رئیس المحققین

مرشدی و مولائی حضرت قاری مولانا پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب مدظلہٗ العالی کی

والدۂ ماجدہ

محترمہ حضرت محفوظ النساء رحمتہ اللہ علیہا

کے نام معنون کرتا ہوں۔

یکے از عُشّاق مرشدی

سرفراز مصطفوی غفر اللہ لہٗ

"ایک شام حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلۂ عالی کے نام"

۱- منجانب : انجمن ترقی اردو

مقام : نیپا آڈیٹوریم

نیپا گلشن اقبال - کراچی

۱۹۸۸ء

"شام ہمدرد"

۲- منجانب : ہمدرد فاؤنڈیشن

مقام : AVARI TOWER کراچی

میزبان : حکیم محمد سعید صاحب

۱۹۹۲ء

"حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ عالی

کی علمی، تحقیقی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں اعزازی تقریب"

۳- منجانب : پاکستان نیشنل اکیڈمی

مقام : شیرٹن ہوٹل - کراچی

میزبان : ڈاکٹر خاور جمیل صاحب

۱۹۹۵ء

"ایک شام حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ عالی کے نام"

منجانب : انجمن ترقی اردو

مقام : نیپا آڈیٹوریم

نیپا گلشن اقبال - کراچی

۱۹۸۸ء

شرکاء

(۱) ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب (سابق استاد و رجسٹرار کراچی یونی ورسٹی)

(۲) ڈاکٹر نجم الاسلام (صدر شعبہ اردو - جامعہ سندھ)

(۳) ڈاکٹر نظر کامرانی صاحب (ڈائریکٹر - علامہ اقبال اوپن یونی ورسٹی کراچی - ریجن)

(۴) ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب (سابق وائس چانسلر جامعہ کراچی)

(۵) نور الحسن جعفری صاحب (صدر انجمن ترقی اردو)

حضرت مولانا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ کے اعزاز میں ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب گلہائے عقیدت اس طرح پیش کرتے ہیں

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب

"چمنے کہ تا قیامت ......"

لائٹ ہاؤس کی سڑک پر دونوں کی اتفاقیہ ملاقات ہوگئی۔ دونوں کی منزل ایک تھی۔ ان میں سے ایک نوجوان استاد تھا۔ دوسرا بھی درجہ اول میں ایم اے کرچکا تھا۔ مگران دنوں بے کار اور پریشان تھا۔ مصافحے اور خیریت دریافت کرنے کے بعد دونوں نانک واڑے کو چل دیے۔ جہاں ان دنوں کراچی یونیورسٹی کے اردو فارسی عربی اور انگریزی کے شعبے عارضی طور پر قائم تھے۔ شعبہ اردو میں کوئی مستقل استاد نہیں تھا۔ مختلف کالجوں کے اساتذہ جز وقتی طور پر تدریسی فرائض انجام دے رہے تھے۔ راستے میں بے کار نوجوان نے شکوہ کیا رضا علی کالج نیا نیا قائم ہوا ہے۔ اردو کے اساتذہ کا تقرر ہونا ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا مجھے وہاں رکھوا دیجیے مگر انھوں نے کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ دوسرے نے کہا یہ بات ان کے مزاج اور روش کے خلاف ہے۔ وہ تو شاگردوں ہی کے لیے نہیں غیروں کے لیے بھی سراپا لطف و کرم ہیں۔ نہ معلوم کیا بات ہے کہ تمہارا خیال نہیں کیا۔ یہ باتیں کرتے ہوئے دونوں شعبۂ اُردو جا پہنچے۔ ڈاکٹر صاحب سال اول کے طلبہ کو اقبال پڑھا رہے تھے۔ بالِ جبریل سامنے تھی۔ دونوں نوجوان خاموشی سے کلاس میں جاکر پیچھے بیٹھ گئے اور لیکچر سننے لگے۔ ڈاکٹر صاحب نے پڑھاتے پڑھاتے دفعتاً" کتاب بند کردی۔ بیکار نوجوان کی طرف دیکھا۔ معمول کے دھیمے اور نرم لہجے میں فرمایا۔ "میں آپ کو رضا علی کالج میں رکھوا سکتا تھا مگر میں نے مناسب نہیں سمجھا۔" یہ کہنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے پھر کتاب کھول لی اور پڑھانے میں مشغول ہوگئے۔ کلاس ختم ہوا تو نوجوان استاد نے ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا۔ "یہ آپ نے درمیان میں کیا بات چھیڑ دی تھی۔ یہ کیا قصہ ہے؟" ڈاکٹر صاحب ہنسے اور فرمایا۔ "یہ باتیں سمجھنے کی نہیں ہیں۔ آپ چائے پئیں یہ چکر چھوڑیئے۔" چند دن کے بعد وہ بیکار نوجوان

ڈاکٹر صاحب کی سفارش پر ایک نہایت عمدہ کالج میں اردو کے استاد مقرر ہوگئے اور بفضلہ آج تک وہیں خدمات انجام دے رہے ہیں۔ البتہ رضا علی کالج کچھ دن اپنی بہار دکھا کر ختم ہوگیا۔ یہ ڈاکٹر صاحب تھے۔ پیرو مرشد استاد مکرم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب اور اس واقعے کا شاہد نوجوان استاد یہ عاجز۔ یعنی یہ سب دید ہے شنید نہیں۔

۱۹۵۰ء میں مجھے شوق ہوا کہ اردو میں بھی ایم اے کیا جائے۔ اس زمانے میں ایم اے کی تدریس کالجوں میں ہوتی تھی۔ یونیورسٹی میں کوئی انتظام نہیں تھا۔ اردو کالج کا شعبۂ اردو اساتذہ کے اعتبار سے بڑا شاندار تھا۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب صدر شعبہ تھے۔ میں نے ایک ایسے دوست سے جو ڈاکٹر صاحب کے ہم وطن اور موصوف کے ایک کرم فرما کے صاحبزادے تھے خواہش ظاہر کی کہ مجھے ان سے ملا دیں۔ چناں چہ ایک شام ہم دونوں اردو کالج گئے پھاٹک ہی میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی۔ لمبا قد لیکن بربنائے انکسار خم۔ دہرا بدن کہ طلب علم و ریاضت میں خستگی سے محفوظ رہے۔ گول چہرہ دائرہ شریعت کی حدود کا ترجمان آنکھوں میں شرم و حیا اور معرفت کی قندیلیں روشن "سیما ھم فی وجوھھم من اثر السجود" رعونت کی سرکوبی کے لیے ترکی ٹوپی سے مزین سر پر حلق کے آثار' محاسن میں پاکیزگی کا حسن گندمی رنگ میں طمانیت کی جھلک معمولی سوتی شیروانی' علی گڑھ کٹ کا پاجاما پاؤں میں سادہ سی گرگابی میرے دوست انہیں دیکھ کر ٹھہر گئے۔ ادب سے سلام کیا۔ مجھ سے کہا ڈاکٹر صاحب سے ملو یہاں اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے کہ تعلق ان دنوں ریڈیو سے تھا جس کے گلیمر کا چرچا کچھ زیادہ ہی تھا۔ تو یہ ہیں ڈاکٹر صاحب۔ خیر چلو یونہی سہی کچھ دن درویشوں کی صحبت ہی میں سہی۔ ممکن ہے تم بھی فیضان نظر سے راہ راست پر آجاؤ ورنہ ایسے بگڑے کہیں سنبھلتے ہیں۔

کلاس شروع ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے لسانیات کا پرچہ شروع کیا۔ نیا مضمون مشکل اور ادق مگر پہلے ہی دن یہ اندازہ ہوگیا کہ ڈاکٹر صاحب اس جدید علم پر مکمل عبور رکھتے ہیں۔ احمد ہمدانی' سید کریم الدین' اکبر کاظمی ہم درس تھے۔ سب ڈاکٹر صاحب کے تبحر علمی سے مسحور ہوگئے۔ پھر جب ڈاکٹر صاحب نے مومن کا ایک قصیدہ شروع کیا تو اپنی سطحی لیاقت کا بھرم بھی کھل گیا۔ بڑا ناز تھا کہ فارسی پر بڑا عبور ہے اور اردو تو "خانہ زاد مرے آشیاں کی

ہے۔" مگروہ نعتیہ قصیدہ۔

زبان لال کہاں اور مدیح تاج خروس گرا ہے خاک پہ کیا تاج افسر کاؤس

ڈاکٹر صاحب نے پڑھایا تو معلوم ہوا کہ لیاقت کسے کہتے ہیں اور علم کس چڑیا کا نام ہے۔ عافیت اسی میں نظر آئی کہ بڑبڑ کرنے کے بجائے کلاس میں خاموش بیٹھو۔ زیادہ سے زیادہ استفادے کی کوشش کرتے رہو۔ ادھر دور رہنے میں عافیت کے آثار، ادھر ڈاکٹر صاحب کے لطف و کرم کی یہ ارزانی کہ کلاس کے بعد روزانہ چائے نوشی اور علمی گفتگو۔

اس زمانے میں برادر مکرم نصراللہ خاں صاحب کہ ریڈیو میں میرے بزرگ رفیق کار تھے۔ اور میں نے ایک دلچسپ شرارت شروع کر رکھی تھی۔ بے شمار لوگ پروگراموں کے لیے آتے رہتے تھے۔ ان میں سے اکثر ہم لوگوں پر اپنے علم کی دھونس بھی گانٹھتے تھے۔ خاں صاحب نے 'اللہ تعالیٰ انہیں سلامت باکرامت رکھے۔ ان مدعیان علم کے دفیعے کے لیے یہ طریقہ وضع کیا تھا کہ ہم دونوں ایسے لوگوں کے سامنے کچھ اس قسم کی گفتگو شروع کر دیتے تھے کہ کاشفی نے العلوم فی البروج میں لکھا ہے یا فلکی نے لطائف الطوائف میں اس مسئلے کی تشریح کی ہے۔ کیوں اسلم تمہیں یاد ہے نا وہ کتاب؟ میں بڑی سادگی سے جواب دیتا' جی ہاں صندل نیشاپوری نے مفتاح الفتوح میں بھی اس پر بحث کی ہے۔ یہ سلسلہ کچھ دیر جاری رہتا اور علم کی دھونس گانٹھنے والوں کے چھکے چھوٹ جاتے۔ ہم لوگوں کو فرضی کتابوں کے نام گڑھنے میں خاصی مہارت ہوگئی تھی۔ بڑی روانی سے گفتگو ہوتی اور خوب ہوتی۔ شاہد بھائی' اللہ تعالیٰ انہیں جنت نصیب کرے اس قسم کی گفتگو سے بڑا لطف لیتے تھے۔ شامت اعمال کہ ایک دن ڈاکٹر صاحب ریڈیو اسٹیشن پر تشریف فرما تھے۔ خاں صاحب اور میں نے معمول کی گفتگو شروع کر دی۔ ڈاکٹر صاحب سنتے رہے۔ ہماری یاوہ گوئی جاری رہی لیکن بولے کچھ نہیں۔ چلتے وقت فرمایا۔ "اگر یہ کتابیں آپ نے دیکھ لی ہوں تو مجھے بھی استفادے کا موقع دیجیے۔ میں بھی ایک نظر دیکھ لوں۔" ہم دونوں پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ میں نے خاں صاحب کی طرف دیکھا مگر وہ "نہ ہر جائے مرکب تواں تاختن" کی تصویر بنے ہوئے تھے۔ بڑا افسوس ہوا مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ یہ ضرور ہوا کہ ہم نے اس قسم کی گفتگو قطعاً" ترک کر دی۔

مجھے ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اتنی دل پذیر معلوم ہوئی کہ میں نے برادرم وحید چغتائی کو

جو اسلامیہ کالج میں ایم اے فائنل کے طالب علم اور ریڈیو میں میرے ساتھی تھے اردو کالج گھسیٹ لیا۔ ہم دونوں ایک دن ہمت کرکے ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر بھی پہنچ گئے۔ معلوم ہوا صوفی صاحب کے یہاں گئے ہیں۔ تین چار دفعہ یہی اتفاق ہوا۔ چغتائی ان دنوں جہانگیر روڈ پر رہتے تھے۔ اکثر اطلاع دیتے ڈاکٹر صاحب سائکل پر چلے جارہے تھے۔ آخر کار ایک دن ملاقات ہو گئی۔ یہاں ڈاکٹر صاحب بالکل بزرگ خاندان کی حیثیت سے پیش آئے۔ چائے تو خیر معمولی بات ہے۔ شام کو بہت کم ایسا ہوا کہ ہم لوگ بغیر کھانا کھائے واپس آئے ہوں۔ کوئی تکلف نہیں۔ ڈاکٹر صاحب نے خود ہی دسترخوان بچھایا۔ سالن روٹی، دال، سبزی لائے سب نے بڑے سکون سے سیر ہو کر کھایا۔ مگر ڈاکٹر صاحب اپنے لیے قلت طعام کے قائل ہیں۔ خود کم کھاتے ہیں اور دوسروں کی تواضع زیادہ کرتے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھی یہی ہوتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہر چیز ہماری طرف بڑھا رہے ہیں اور اصرار کر رہے ہیں۔ ایک شام میں حاضر ہوا۔ ڈاکٹر صاحب تنہا تھے۔ تھوڑی دیر کے لیے اندر گئے۔ پھر چائے کی دو پیالیاں لیے ہوئے باہر تشریف لائے۔ میں نے دریافت کیا کہ استانی اور ہاجرہ تو ہیں نہیں۔ چائے کیسے بن گئی؟ ارشاد ہوا۔ میں نے بنائی ہے۔ میں حیرت سے ڈاکٹر صاحب کو دیکھتا رہ گیا۔ ایک ادنیٰ شاگرد کے لیے یہ اہتمام !

ہم لوگ کبھی کبھی شوخی سے بھی کام لیتے تھے کہ یہ ہماری غفلت اور بے شعوری کا دور تھا۔ ایک دن چغتائی نے ڈاکٹر صاحب سے کہا۔ آپ کو اتنی تنخواہ ملتی ہے۔ آپ اتنے بہت سے روپوں کا کیا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب خاموش رہے۔ چغتائی کہنے لگے۔ ایسا کیوں نہ کیجیے کہ ایک مہینے ایک شیروانی میرے لیے، اگلے مہینے ایک شیروانی اسلم کے لیے بنوا دیجئے۔ کچھ یہ سلسلہ بھی ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب اس پر بھی چپ رہے۔ بات آئی گئی ہوئی کیوں کہ یہ محض چغتائی کی شاعرانہ ترنگ تھی۔ پہلی تاریخ ہوئی تو ڈاکٹر صاحب نے مجھے اور چغتائی کو پچاس پچاس روپے دیے اور فرمایا کہ آپ لوگ شیروانیاں بنوالیجیے۔ ہم دونوں بڑے شرمندہ ہوئے۔ لاکھ انکار کیا مگر ڈاکٹر صاحب نے ایک نہ سنی اور روپے ہمیں لینا ہی پڑے۔ اس دن کے بعد سے میں اور چغتائی دونوں بڑے محتاط ہو گئے اور بہت سوچ سمجھ کر گفتگو کرنے لگے۔ ایک عجیب بات میں نے یہ دیکھی کہ کلاس کے بعد ڈاکٹر صاحب

جب چائے منگواتے تو چائے والے کے لیے شیروانی کے نیچے کی جیب سے روپیہ نکالتے۔ چہرہ شاہی نہیں نشان ملک۔ روپے نیچے کی جیب میں رکھنے کی عادت سے یہ اندازہ ہوا کہ ڈاکٹر صاحب بنائے فساد کو دل کے قریب نہیں آنے دیتے ہمیشہ دل سے دور رکھتے ہیں۔

کالج میں ڈاکٹر صاحب شفیق اور ہنس مکھ استاد کی حیثیت رکھتے تھے۔ زہد و ورع اور تقویٰ اپنی جگہ مگر طلبہ اور اساتذہ کے کرکٹ میچ میں لڑکوں نے ڈاکٹر صاحب کے پیروں میں بھی پیڈ باندھے اور ڈاکٹر صاحب نے ہنسی خوشی کریز میں کھڑے ہو کر بلا گھمایا۔ آرنلڈ کی کلچر اینڈ انار کی اس زمانے میں بی اے کے نصاب میں شامل تھی۔ طلبہ اس کے مطالعے سے گھبراتے تھے۔ ایک بار بعض طالب علموں نے اس کتاب کے حوالے سے اپنی پریشانی اور دقتوں کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے ساری مصروفیت کے باوجود کتاب کا ایک نہایت عمدہ خلاصہ تیار کر کے طلبہ کو دے دیا۔ سارے ضروری مباحث کا احاطہ تھا۔ سلیس اور آسان انگریزی کے طلبہ کو سمجھنے میں دقت نہ ہو۔ یہ مشکل کام ڈاکٹر صاحب نے محض طلبہ کی سہولت کے لیے انجام دیا۔ وہ نہ انگریزی کے استاد تھے۔ نہ انگریزی کی دقت دور کرنا ان کی ذمہ داری تھی۔ لیکن انہیں دوسروں کو فائدہ پہنچانے میں راحت محسوس ہوتی ہے کسی کا بھلا ہو جائے تو انہیں خوشی ہوتی ہے۔ ایک بار سندھ کے کسی کالج کے ایک استاد مجھ سے ملنے آئے۔ کچھ تحقیقی کام کر رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا حوالہ دیا۔ چند کتابیں درکار تھیں۔ میں نے خوشی خوشی کتابیں ان کے حوالے کر دیں۔ بہت دن گزر گئے کتابیں واپس نہ پہنچیں۔ ایک دفعہ ڈاکٹر صاحب سے ذکر آیا کہ بہت دن ہوئے فلاں صاحب آپ کے حوالے سے کچھ کتابیں لے گئے تھے۔ فرمایا میں انہیں جانتا نہیں ہوں۔ تاہم اگر میرے حوالے سے کسی کا بھلا ہو جائے تو کیا مضائقہ ہے۔ پھر کہا۔ تا بمقدور ہر شخص کی مدد کرنا چاہیے۔ آپ جس کی مدد کریں گے ممکن ہے کہ وہ آئندہ کسی اور کی مدد کرے اور سلسلہ جاری رہے۔ ڈاکٹر صاحب کی امداد تو ہمیشہ شامل حال رہتی ہے۔ ایک دفعہ مجھے فیضی کے ان چار مصرعوں میں ذرا سا شبہ ہو گیا جو اس نے دربار اکبری میں حاضر ہوتے ہی پڑھے تھے ڈاکٹر صاحب کے یہاں دو تین دفعہ گیا م وہ ملے نہیں۔ ناچار پرچہ لکھ کر چھوڑ آیا۔ اگلی دفعہ گیا تب بھی ڈاکٹر صاحب موجود نہیں تھے۔ مگر کتاب اور حوالے کا نشان میرے لیے رکھا ہوا تھا۔ کالج کے بعض طلبہ ایسے بھی

کہ سرتاپا ڈاکٹر صاحب کے رنگ میں رنگ گئے۔ برادرم ڈاکٹر یحیٰ احمد ہاشمی اور مخدومی شعور احمد فاروقی کے نام مجھے اس سلسلے میں یاد آتے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے ان کی ذہنی اور روحانی تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی۔ عمومی توجہ میں بھی یہ شان دل نوازی کہ ادھر طالب علم نے خدا اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا واسطہ دیا اور ادھر ڈاکٹر صاحب نے اس کی مراد پوری کی۔ کسی نے کچھ کہا تو ڈاکٹر صاحب کا ارشاد ہوا۔ کیا خدا اور رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے واسطے سے بھی بڑھ کر کوئی واسطہ ہے۔ انکسار اور تالیف قلوب کی یہ کیفیت کہ اپنی ذات سے کسی کو تکلیف نہیں دیتے۔ کالج کی طالب علمی اور اس کے کچھ عرصے بعد تک میں پاکستان چوک کے ایک فلیٹ میں رہتا تھا۔ ایک دن پڑوس کے ایک لڑکے نے مجھے بتایا کہ اردو کالج کے ایک ڈاڑھی والے اُستاد بڑی دیر سے سڑک پر ٹہل رہے ہیں۔ میں نے سوچا۔ لاؤ دیکھیں کون ہے؟ نیچے گیا دیکھا تو ڈاکٹر صاحب۔ ارے آپ' آواز کیوں نہیں دی۔ یہاں کب سے ٹہل رہے ہیں۔ بڑی زحمت ہوئی۔ فرمایا۔ "آواز دینا مناسب نہیں معلوم ہوا۔ ممکن ہے آپ مصروف ہوں۔ کوئی کام کر رہے ہوں۔ حرج ہوتا۔ یہ سوچا تھا کوئی نیچے آئے گا تو کہلوادوں گا۔ آپ خود ہی نیچے تشریف لے آئے۔" یہ واقعہ ایک بار نہیں بار بار ہوا۔ میرے عاجزانہ اصرار کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے آواز دینا گوارا نہ کیا۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب نے "فارسی پر اردو کا اثر" شایع کی۔ مجھے فخر ہے کہ اس کا اشاریہ میں نے مرتب کیا "کہ میرا نام بھی شامل ہے تیرے نام کے ساتھ۔" "حالی کا ذہنی ارتقاء" بھی اسی زمانے کی یادگار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو علمی تحقیق سے غیر معمولی لگاؤ ہے۔ ایک دفعہ میں نول کشور کا شایع کردہ ظہیر فاریابی کا دیوان غزلیات پڑھ رہا تھا۔ اس دیوان میں گاؤ تکیہ کی ترکیب نظر سے گزری تو بڑا اچنبھا ہوا کہ یہ ہند فارسی ترکیب ظہیر کے یہاں کیسے پہنچی۔ ڈاکٹر صاحب کو دکھائی۔ آپ نے پوری کتاب پڑھی اور پھر ایک معرکہ آرا تحقیقی مضمون لکھ کر ثابت کردیا کہ نول کشوری دیوان غزلیات ظہیر فاریابی کا نہیں کسی اور شاعر کا ہے۔ بڑا کام کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے علمی اور دینی۔ بے شمار علمی اور تحقیقی مضامین شایع کیے۔ قیام پاکستان سے بہت پہلے ڈاکٹر صاحب کے مضامین "معارف اردو" اورینٹل کالج میگزین میں شایع ہوتے تھے۔ سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ کی "نقوش سلیمانی" میں ڈاکٹر

صاحب کے مضامین کے حوالے ہیں۔ "اقبال اور قرآن" ڈاکٹر صاحب کی ایک ایسی تالیف ہے جسے شاید ہی کوئی اور مرتب کرنے کی ہمت کرتا۔ تصوف اور بالخصوص سلسلہ نقشبندیہ کے بارے میں ڈاکٹر صاحب نے بے انتہا کام کیا ہے۔ اس ضمن میں ڈاکٹر صاحب نے سندھ پنجاب اور شمالی علاقوں کی تمام خانقاہوں کا جائزہ لیا ہے۔ وہاں کے قلمی نسخے دیکھے ہیں۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر صاحب ساری تعطیلات سفر میں گزارتے تھے اور سلسلے کی معلومات حاصل کرتے رہتے تھے۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ حضرت میرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمہ شہادت کے وقت ایک فرغل پہنے ہوئے تھے۔ وہ دیر کی کسی خانقاہ میں محفوظ ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اسے ملاحظہ بھی فرمایا اور بہ خیال برکت زیب تن بھی فرمایا۔ اس سے یہ بھی اندازہ ہوا کہ میرزا صاحب علیہ الرحمہ کا قد و قامت اور جسم ڈاکٹر صاحب ہی کی طرح کا تھا۔ ڈاکٹر صاحب قواعد، عروض، تاریخ گوئی اور فارسی کے کلاسیکی ادب کے بڑے عالم ہیں۔ شعر کا بڑا پاکیزہ ذوق رکھتے ہیں۔ سید حسن غزنوی کے بارے میں ان کا تحقیقی مقالہ اور انگریزی تالیف "A History of Behram Shah Ghaznavi" خاصے کی چیزیں ہیں۔ حال ہی میں میرزا مظہر جان جاناں علیہ الرحمہ کا فارسی دیوان اور "خریطۂ جواہر" بھی ڈاکٹر صاحب نے از سر نو شائع کر دیا ہے۔ بڑی خاموشی سے علمی کام کرتے رہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کی طالب علمی کا پورا دور علی گڑھ میں گزرا ہے۔ ایک مضمون میں ڈاکٹر صاحب نے ہوسٹل کے بعض لوگوں کا دلچسپ انداز میں تذکرہ بھی کیا ہے۔ مگر جناب حمید جالندھری کے بقول جو ڈاکٹر صاحب کے علی گڑھ کے ہم جماعت ہیں۔ ڈاکٹر صاحب طالب علمی میں بھی بزرگ آثار تھے۔ علی گڑھ سے فارغ ہو کر ڈاکٹر صاحب کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی سے وابستہ رہے۔ قیام پاکستان کے وقت ڈاکٹر صاحب ناگپور یونیورسٹی میں صدر شعبہ تھے۔ وہیں سے ترک وطن کر کے کراچی آئے۔ کچھ دن اسلامیہ کالج میں رہے۔ پھر اردو کالج آگئے۔ ڈاکٹر صاحب کراچی یونیورسٹی کے قیام کے وقت اردو کی پروفیسری کے امیدوار تھے۔ یونیورسٹی نے سرے سے پروفیسر رکھا ہی نہیں۔ اس واقعے کے بعد میں خدمت میں حاضر ہوا تو اس مسئلے پر گفتگو ہوئی۔ میں نے افسوس کا اظہار کیا۔ فرمایا افسوس کرنا تقاضائے بشری ہے۔ مگر میں جب اس مسئلے کے بارے میں سوچتا ہوں تو آیہ کریمہ "اَلَیْسَ اللّٰہُ بِکَافٍ عَبْدَہٗ"

یاد آتی ہے اور میرا سارا ملال ختم ہو جاتا ہے۔ واقعی اللہ اپنے بندوں کے لیے بہت کافی ہے۔ کچھ ہی دن بعد ڈاکٹر صاحب پروفیسر ہو کر حیدر آباد تشریف لے گئے۔ شکر خورے کو شکر ہی ملتی ہے۔ پروفیسری کے امیدوار تھے اللہ تعالیٰ نے انہیں پروفیسری ہی سے نوازا مگر یقین تو ہو۔ جو ہو ذوق یقیں پیدا۔ ڈاکٹر صاحب خیر سے حیدر آباد سدھارے مگر ہم لوگوں کو بڑا صدمہ ہوا۔ حالت یہ تھی کہ چھٹے اور پہنچے۔ صبح، دوپہر، شام جب جی چاہا اٹھے اور چلے گئے۔ کالج پہنچ گئے، نہیں تو ایک نمبر کی بس پر بیٹھے اور پیر کالونی۔ کیا زمانہ تھا۔ آنا جانا موجب فرحت ہوتا تھا۔ اب کہیں جانا ہو تو وحشت بھی ہوتی اور دہشت بھی۔

ڈاکٹر صاحب پیر کالونی میں بھی مرجع خاص و عام تھے۔ حیدر آباد میں بھی لعلوں کے لعل بنے بیٹھے ہیں۔ صبح سے شام اور شام سے رات تک عقیدت مندوں کا تانتا بندھا رہتا ہے۔ مجھے بے اختیار شیخ شیراز کا شعر یاد آتا ہے۔

ہر کجا چشمہ بود شیریں — مردم و مرغ و مور گرد آیند

مگر ڈاکٹر صاحب مزاحمت خلق سے کبھی آزردہ نہیں ہوتے نہ کسی کی بداخلاقی پر ناراضی کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک دفعہ سندھ یونیورسٹی میں ایک ایسے صاحب وائس چانسلر مقرر ہوئے جو ایک پیشہ وارانہ کالج کے پرنسپل تو رہ چکے تھے مگر تکریم اساتذہ کے احساس سے بے بہرہ تھے۔ چارج لینے کے بعد وہ صدور شعبہ سے ملے۔ اردو کے صدر کو ملائے مکتب سمجھ کر انہوں نے خفیف الحرکاتی کا مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر صاحب خاموش رہے اور چپ چاپ اُٹھ آئے مگر تمام صدور شعبہ نے سخت احتجاج کیا اور وائس چانسلر سے کہا۔ آپ ڈاکٹر صاحب کے گھر جا کر ان سے معافی چاہیں۔ آپ نے ایک بزرگ کی توہین کی ہے۔ اس کا مداوا معافی اور صرف معافی ہے۔ وائس چانسلر صاحب شام کو ڈاکٹر صاحب کے گھر پہنچے۔ دیکھا کہ اس وقت کے صوبائی وزیر تعلیم ڈاکٹر صاحب کے پاؤں پکڑے بیٹھے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کے لیے دعا کر رہے ہیں۔ انہوں نے بھی پاؤں پکڑ لیے "قدم کو ہاتھ لگاتا ہوں بخش دیجیے خطا" جب تک وہ رہے ڈاکٹر صاحب کا دم بھرتے رہے۔ ان کے نام کا کلمہ پڑھتے رہے۔ علامہ آئی آئی قاضی ہوں، ڈاکٹر رضی الدین صدیقی ہوں، حسن علی عبدالرحمٰن ہوں، سید غلام مصطفیٰ شاہ ہوں۔ سب ڈاکٹر صاحب کے عقیدت مند تھے اور ان کا بڑا احترام کرتے تھے۔

سندھ یونی ورسٹی کیا، ساری علمی دنیا میں ڈاکٹر صاحب عظمت اور بزرگی کے حامل سمجھے جاتے ہیں۔ سندھ یونی ورسٹی میں ڈاکٹر صاحب کے احترام کی کیفیت یہ ہے کہ پی ایچ ڈی کے زبانی امتحان کے لیے انہیں شعبے میں زحمت نہیں دی جاتی بلکہ ان کے دولت کدے ہی پر امتحان ہوتا ہے۔ ایک دفعہ بڑا اچھا اجتماع ہوا۔ محمد حسن عسکری مرحوم تھے۔ پروفیسر طاہر فاروقی مرحوم تھے۔ راقم الحروف بھی شریک تھا۔ امتحان کے بعد بڑی عمدہ نشست ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کی بعض باتوں پر حیرت ہوتی ہے۔ دن رات عقیدت مند انہیں گھیرے رہتے ہیں۔ ان کی جگہ دوسرا آدمی ہو تو گھبرا جائے مگر اس مزاحمت خلق کے باوجود ڈاکٹر صاحب علمی کاموں کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ مطالعہ کس وقت کرتے ہیں۔ لکھتے کس وقت ہیں سمجھ میں نہیں آتا۔ پھر یہ بھی نہیں کہ ہلکے پھلکے مضامین لکھ دیے۔ علمی مضامین، تحقیقی مضامین، حوالوں سے پر کتابوں پر کتابیں شایع ہو رہی ہیں۔ خدا معلوم وقت کیسے نکالتے ہیں اور کس طرح یہ کام کرتے ہیں۔ ان کی زبان فیض ترجمان سے کم فرصتی کا شکوہ بھی کبھی سننے میں نہیں آیا نہ کسی اضطراب کا کوئی مظاہرہ ہوا کہ مجھے فلاں جگہ جانا ہے۔ فلاں کام ہے، سخت عدیم الفرصت ہوں۔ اس قسم کی کوئی بات گزشتہ چالیس برس میں میں نے نہیں دیکھی۔ صرف ایک دفعہ یہ فرمایا کہ ان دنوں میرے شیخ آئے ہوئے ہیں اس لیے فرصت کم ملتی ہے۔ کمزور بہت ہو گئے ہیں۔ کمزوری کی وجہ سے اکثر چکر آتے ہیں مگر جب دیکھا تو یہی کہ لوگوں میں گھرے بیٹھے ہیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ ہے۔ دھیمے اور نرم لہجے سے کانوں میں رس گھول رہے ہیں۔ سننے والے ہمہ تن گوش ہیں۔ ایک بات میں نے خاص طور پر یہ دیکھی کہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں دس بیس آدمی بیٹھے ہیں تو ان میں سے ہر شخص یہ محسوس کر رہا ہے کہ جیسے ڈاکٹر صاحب کی توجہ اور لطف و کرم سب سے زیادہ اسی پر ہے۔ کم نگاہی کا گمان کسی کو نہیں۔ ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ توجہ میری ہی جانب ہے۔

ڈاکٹر صاحب ناراض نہیں ہوتے۔ ناراض ہونا تو دور کی چیز ہے اونچی آواز سے بھی بات نہیں کرتے۔ سندھ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو میں ایک چپراسی عبدالغفور نامی تھے۔ بامسمیٰ تو نہیں تھے مگر صاحب کمال صوری و معنوی تھے۔ یونی ورسٹی کا کوئی محکمہ اور شعبہ انہیں اپنے یہاں رکھنے پر تیار نہیں تھا۔ سب ان کا نام سنتے ہی کانوں پر ہاتھ رکھتے تھے۔ مگر

ڈاکٹر صاحب نے خوشی خوشی انہیں اپنے شعبے میں لے لیا۔ عبدالغفور بھی ایسے ڈھیٹ کہ جب موقع ملا ڈاکٹر صاحب کی کتابیں چرا کر بیچ دیں۔ ڈاکٹر صاحب شعبے میں بیٹھے ہیں اور وہ مکان پر پہنچا۔ کہا' ڈاکٹر صاحب نے باہر والی الماری کے پہلے خانے کی سب کتابیں منگوائی ہیں۔ گھر والوں کو کیا معلوم۔ انہیں سے چادر لی۔ پوٹلا بنایا۔ چل دیے۔ کتابوں کے کوڑے کیے اور غائب۔ دو تین دن کے بعد مس مسی صورت بنائے چلے آرہے ہیں۔ شعبے میں کوئی تقریب ہونے والی ہے۔ کھانے پینے کا سامان آیا رکھا ہے۔ بھائی نے موقع دیکھ کر خاموشی سے سب صاف کردیا اور چپکے سے تراٹ ہوگئے۔ لڑکے ہیں کہ انہیں ڈھونڈ رہے ہیں اور وہ پُرخوری کے سرور میں آنکھیں موندے کسی کونے کھدرے میں قیلولہ فرمارہے ہیں۔ (برادرم ڈاکٹر حسرت کاس گنجوی نے ان کا بڑا دلچسپ خاکہ لکھا ہے) مگر ان سب باتوں کے باوجود ڈاکٹر صاحب نے ایک لفظ بھی منہ سے نہیں نکالا۔ ڈاکٹر صاحب کے ایک شاگرد تھے' خدا مغفرت کرے ڈاکٹر صاحب ہی کے ساختہ پرداختہ تھے۔ مگر ساری زندگی ماہیان شبگوں کے شکاری رہے۔ ہمیشہ ڈاکٹر صاحب کے خلاف باتیں بناتے رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کو سب خبر تھی مگر کبھی کہا کچھ نہیں۔ جب بھی ان کا تذکرہ کیا اچھے ہی الفاظ میں کیا۔ دعائیں ہی دیں۔ خواجہ حسن سجزی کے بقول حضرت سلطان المشائخ نظام الدین اولیا محبوب الٰہی رحمتہ اللہ علیہ نے ایک دن فرمایا کہ ''اندپت کا ایک شخص چھجو مجھے ہمیشہ برا کہتا تھا اور میرا برا چاہتا تھا۔ جب وہ مر گیا تو اس کے مرنے کے تیسرے دن میں اس کی قبر پر گیا اور دعا کی کہ یاالٰہی اس نے میرے حق میں جو کچھ برا کہا اور برا چاہا میں نے سب معاف کیا تو اس وجہ سے اسے عقوبت نہ فرما۔'' یہی مسلک ڈاکٹر صاحب کا ہے۔ کہنے والے کچھ بھی کہیں وہ دعا ہی فرماتے رہیں گے۔ ہاں ڈاکٹر صاحب مذمت بھی کرتے اور سخت الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ مرتدین اور دین کا استحقاق کرنے والوں کے لیے۔ ایک زمانے میں ڈاکٹر صاحب ایک بڑے عالم کے صاجزادے کے علمی تبحر اور عربی دانی کے بڑے معترف تھے۔ بہت اچھے الفاظ میں ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ وہ باہر چلے گئے۔ شیطان نے انگلی جو دکھائی تو دین حق سے منحرف ہو کر تثلیث کے پیرو ہوگئے۔ ان کے اس تین تیرہ ہونے میں شاید ننانوے کا پھیر تھا۔ ڈاکٹر صاحب نہایت واضح اور واشگاف الفاظ میں ان کی مذمت فرماتے تھے۔ ''اشدآء علی الکفّار''

کی کیفیت یہی ہے۔

ڈاکٹر صاحب اپنے بزرگوں کا غیر معمولی احترام کرتے ہیں۔ والدہ جب تک حیات رہیں ان ہی کے ساتھ رہیں۔ بڑی خدمت کرتے تھے ڈاکٹر صاحب۔ ڈاکٹر صاحب کے برادر بزرگ مزاج کے خاصے کڑوے تھے مگر ڈاکٹر صاحب ان کا اتنا احترام کرتے تھے کہ حیرت ہوتی تھی۔ میں نے دونوں بھائیوں کو یکجا دیکھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ہیں کہ بچھے جا رہے ہیں۔ بھائی صاحب ہیں کہ اپنی جگہ چھوٹے بھائی کی عظمت کو سمجھ رہے ہیں مگر خاموش ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنے اساتذہ کا تذکرہ بھی بڑی محبت سے کرتے ہیں۔ مولانا احسن مارہروی مرحوم اور پروفیسر ضیاء احمد بدایونی مرحوم کا ذکر ہم لوگوں نے ڈاکٹر صاحب سے کلاس میں بھی سنا اور کلاس کے باہر بھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کے حسب ارشاد مولانا احسن کے بارے میں ایک تحقیقی مقالہ لکھوایا تو بڑی مسرت کا اظہار کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے طالب علم کی مدد ہی نہیں کی رہنمائی بھی فرمائی۔

خندہ جبینی بزرگوں کا شعار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں خندہ جبینی بھی ہے اور حسِ مزاح کا لطیف اظہار بھی۔ میرے ایک دوست کی بہن کے لیے سندھ یونی ورسٹی کے ایک استاد کا رشتہ آیا۔ رقعے کے مطابق وہ صاحب پروفیسر بھی تھے اور ڈاکٹر بھی۔ دوست نے مجھ سے معلومات کے لیے کہا۔ یہاں مُلّا کی دوڑ مسجد ڈاکٹر صاحب کو خط لکھ دیا۔ تیسرے دن جواب آیا۔ "میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان صاحب کو پی ایچ ڈی بھی کرادے، پروفیسر بھی بنوادے اور دوسری شادی انہیں راس آئے۔" لطیف پیرایہ ہے۔ ہنسی ہنسی میں سب کچھ ہے۔ کوئی شدت۔ طنز یا درشتی نہیں۔ اس قسم کے فقرے ڈاکٹر صاحب گفتگو میں بھی کہتے ہیں اور خطوں میں بھی تحریر فرماتے ہیں۔ وہ خط کا جواب لکھنے میں تاخیر کے قائل نہیں۔ خط پڑھا قلم اٹھایا سیدھا سادا مختصر جواب لکھ دیا۔ نہ عبارت آرائی، نہ لفّاظی، نہ علمیت کا کوئی اظہار۔ ڈاکٹر صاحب کی تحریر بھی ان کی شخصیت کی طرح پاکیزہ ہے۔ عام طور پر کارڈ لکھتے ہیں۔ لفافہ کم آتا ہے۔ مگر لفافے والا خط بھی طول طویل نہیں ہوتا۔ سادہ دل نشیں اور مختصر۔ میرے پاس ڈاکٹر صاحب کے مکاتیب کا بہت بڑا ذخیرہ ہے۔ شان تحریر ایسی کہ نگاہوں میں کھب جائے۔ دائرے متناسب، شوشوں کا صحیح التزام۔ ہر لفظ موتی کی طرح آبدار۔ خط

میں چھوٹے چھوٹے فقرے لطیف اور پرکار۔ بس ایک چیز ایسی ہے جس سے مسئلہ پیدا ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب خط عموماً" چھوٹے چھوٹے پرزوں پر لکھتے ہیں۔ انہیں محفوظ رکھنے میں دقت ہوتی ہے۔ آرزو کا مصرع مجھے یاد آتا ہے۔ "دامن اس یوسف کا آیا پرزے ہو کر ہاتھ میں" مگر دامن یوسف پھر دامن یوسف ہے۔

ڈاکٹر صاحب گھلنے ملنے اور تقریبوں میں شرکت کرنے سے اب بربنائے ضعف بچتے ہیں۔ پہلے ایسی بات نہیں تھی۔ محفلوں اور تقریبوں میں بے تکلفی سے شریک ہوتے تھے اور پورے وقت تشریف فرما رہتے تھے۔ مجھے فخر ہے کہ میرے دونوں بیٹوں کو بسم اللہ ڈاکٹر صاحب نے پڑھائی۔ تسمیہ خوانی کی تقریب میں شرکت کرنے کے لیے خاص طور سے حیدر آباد سے تشریف لائے۔ تقریب میں پورے وقت تشریف فرما رہے۔ یہ نہیں کہ تھوڑی دیر کے لیے شرکت کی اور رخصت ہو گئے۔

میرا مشاہدہ ہے کہ بیشتر اہل علم میں ایک غیر معمولی ادعا ہوتا ہے۔ انسان جب علم کے کمال پر پہنچتا ہے تو اس کی انانیت بہت بڑھ جاتی ہے۔ ہمارے یہاں درجہ کمال حاصل نہیں ہوتا۔ صرف انانیت بڑھتی ہے۔ میں نے یہ لکھا۔ میں نے یوں لکھا۔ ان کا موضوع ہو یا نہ ہو ماہرانہ رائے کا اظہار ضرور کریں گے اور اس زور و شور سے کہ اگلا منہ دیکھتا رہ جائے بلکہ بسا اوقات تو منہ پیٹتا رہ جائے۔ ڈاکٹر صاحب کے یہاں اس قسم کا کوئی ادعا نہیں۔ ان کے کسی مضمون یا کتاب کے بارے میں بات کیجیے تو ہنس کر ٹال جائیں گے۔ جیسے آپ نے کوئی غیر ضروری بات چھیڑ دی ہو۔ بحث اور اختلاف رائے سے ہمیشہ گریز کرتے ہیں۔ اگر کوئی عالم ان سے اختلاف رائے بھی کرتا ہے تو جواب میں ایسے انکسار اور عاجزی کا اظہار کرتے ہیں کہ معترض شرمندہ ہو جاتا ہے۔ ولی کے ایک شعر ؎

بعد شاہ نجفؑ ولی اللہ   پیر کامل علی رضاؑ پایا

کے بارے میں ڈاکٹر صاحب کی رائے یہ ہے کہ اس شعر میں ولی اللہ اپنے نام کے طور پر استعمال کیا ہے۔ نام کے اس قسم کے استعمال کی متعدد مثالیں بھی ڈاکٹر صاحب نے اساتذہ سلف کے کلام سے پیش کی ہیں۔ ڈاکٹر شادانی مرحوم کو اس رائے سے اختلاف تھا۔ اختلاف میں کوئی مضائقہ نہیں کہ صحت مند اختلاف رائے سے فکر کے نئے گوشے سامنے آتے

ہیں۔ مگر شادانی صاحب نے اختلاف رائے کے اظہار میں ایسے الفاظ استعمال کیے جو کسی بزرگ محقق کے شایان شان نہیں تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے شادانی صاحب کے اعتراض اور نامناسب الفاظ کا جواب جس انکسار اور عاجزی سے لکھا جو لطیف پیرایہ اختیار کیا اس کی مثالیں کم ہی ملتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں۔

"بالکل اتفاقیہ طور پر اردو نامہ (اکتوبر ۱۹۶۷ء) کے باب مراسلت کے تحت محترم ڈاکٹر شادانی صاحب کا مراسلہ دیکھا جو انہوں نے راقم الحروف کی اصلاح کے لیے لکھا تھا۔ قاعدہ یہ ہے کہ جس شخص کی اصلاح کی جائے اسے اس اصلاح کی نقل یا کم از کم اطلاع ضرور دی جائے کیونکہ ضروری نہیں کہ وہ شخص خود ہی ایسی اصلاح کو ڈھونڈ نکالے اور مستفیض ہو۔ معلوم نہیں ڈاکٹر صاحب نے اس دیرینہ نیاز مند کو کیوں محروم رکھا........ ڈاکٹر شادانی صاحب کا خیال ہے کہ شاعر کا نام صرف مقطعے میں آتا ہے اور مقطعے کے علاوہ نہیں آتا۔ یہ بات چونکہ آں محترم فرمارہے ہیں لہٰذا صحیح ہوگی لیکن ہمارے پاس شواہد کچھ اور ہی ہیں۔"

کیسی مسکینی اور سادگی ہے۔ یہ چیزیں آج کل کے زمانے میں بالکل عنقا ہیں۔ میں نے ادعا اور انانیت والی بات جو کہی اس سلسلے میں یہ امر بھی قابل غور ہے کہ ڈاکٹر صاحب جس موضوع سے واقف نہیں یا جس موضوع سے انہیں دلچسپی نہیں اس کے بارے میں کبھی گفتگو نہیں کرتے۔ صاف کہہ دیتے ہیں۔ "بھائی میں اس بارے میں کچھ نہیں جانتا۔" افسانوی ادب کے بارے میں جب بھی بات چھڑی ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ "میرا یہ میدان نہیں۔ بہتر ہے آپ کسی اور سے رہنمائی حاصل کرلیجیے۔" بظاہر یہ بات بہت عجیب معلوم ہوتی ہے کہ ہم تو بزعم خویش ہمہ دانی اور ہمہ اوست کے نظریے پر عامل ہیں مگر ڈاکٹر صاحب ہیں کہ ہمہ ازوست کہہ کر دامن بچالیتے ہیں۔ ویسے ڈاکٹر صاحب جس سلسلے سے تعلق رکھتے

ہیں وہ بھی ہمہ ازوست والا سلسلہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نہایت دیانت دار اور محنتی استاد اور عالم ہیں۔ ہر تحریر کو پوری ذمہ داری اور ناقدانہ نگاہ سے جانچتے اور پرکھتے ہیں۔ میری نگرانی میں لکھے جانے والے بعض تحقیقی مقالوں کے ممتحن ڈاکٹر صاحب تھے۔ آپ نے کبھی سرسری رائے نہیں لکھی۔ تفصیلی رائے اور حد یہ ہے کہ ٹائپ میں ہونے والی املا کی تمام اغلاط کی تفصیل اور ان غلطیوں کی نشان دہی فرمائی جنہیں بقول میرؔ صاحب "لوگ کہتے ہیں سہو کاتب ہے۔"

ڈاکٹر صاحب کا لباس ہمیشہ سادہ رہا۔ سادہ شیروانی۔ سفید کرتا یا قمیص۔ لٹھے کا پاجاما۔ شیروانی کے کپڑے میں کوئی اہتمام نہیں۔ مدتوں ترکی ٹوپی پہنی۔ اب کپڑے کی ٹوپی پہنتے ہیں۔ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کرتے ہیں۔ دوسروں کو زحمت نہیں دیتے۔ ایک دن دوپہر کو میرے یہاں قدم رنجہ فرمایا۔ پسینے میں شرابور ہو رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد غسل خانے تشریف لے گئے۔ کچھ دیر کے بعد میں غسل خانے میں گیا تو دیکھا ڈاکٹر صاحب نے بنیان دھو کر لٹکا دی ہے۔ میں نے ڈرتے ڈرتے عرض کیا۔ آپ نے کیوں زحمت فرمائی۔ خدمت کے لیے ہم لوگ موجود ہیں۔ ارشاد ہوا۔ اپنا کام خود کرنا چاہیے۔ دوسروں کو زحمت دینا اچھا نہیں لگتا۔ ڈاکٹر صاحب کی سادگی اور انکسار کی کیفیت تو یہ ہے کہ ایک دفعہ میں نے ان کے لیے رکشا روکا۔ آپ نے سفید ڈاڑھی والے معمر رکشا ڈرائیور کو دیکھا تو فرمایا "دین دار آدمی معلوم ہوتا ہے" اور بڑھ کر اسے سلام کیا۔ ڈاکٹر صاحب ہمیشہ سلام میں سبقت فرماتے ہیں۔ بظاہر چھوٹی سی بات ہے مگر اسی چھوٹی سی بات سے انسان کے کردار اور مزاج کا اندازہ ہوتا ہے۔ لوگ تو منتظر رہتے ہیں کہ اگلا انہیں سلام کرے۔ کن انکھیوں سے دیکھتے رہتے ہیں۔ بہت سے نک چڑھے کالے آدمی کے سلام کا جواب دینا بھی شان کے خلاف سمجھتے ہیں۔ بقول ارم لکھنوی ؎

یوں وہ گزرے نظر چرائے ہوئے ہم لیے رہ گئے سلام اپنا

ادھر کچھ دن سے دین کا چرچا بہت سننے میں آرہا ہے۔ بڑی خوش آئند بات ہے۔ زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھو۔ مگر منہ میں رام بغل میں چھری والی بات بھی کچھ ایسی غلط نہیں۔ جلسے جلوس، محفلوں، مذاکروں، اخباروں میں دین ہی دین مگر اپنی اور اپنے گھر کی بات آئی تو

رام دہائی۔ ہم میں سے 'اور ہم سے میری مراد' ملک کے پڑھے لکھے باشعور طبقے سے ہے۔ کتنے ایسے ہیں جنہوں نے اپنی نئی نسل کو دنیا کے بجائے دین کی تعلیم کے لیے وقف کیا۔ میرا خیال ہے شاید کسی نے بھی نہیں دنیا دل و دماغ پر ایسی چھائی ہے کہ سب ہرا ہی ہرا نظر آرہا ہے۔ پڑھو سائنس اور قوم کی ڈگمگ ڈولتی نیا کو پار لگاؤ۔ ڈاکٹر صاحب کا عمل اس کے برعکس ہے۔ ان کے صاحب زادے ڈاکٹر سراج احمد سلمہ' معارف اسلامیہ کے طالب علم رہے۔ حضرت مجدد علیہ الرحمہ کے مکتوبات کی معاشرتی اہمیت پر بڑا نفیس مقالہ لکھ کر سند حاصل کر چکے ہیں۔ ماشاء اللہ پابند صوم و صلوٰۃ۔ حاجی حرمین الشریفین اور جوانی میں سعادت آثار ہیں۔ سراج میاں کے ایک صاحب زادے نے بڑی کم عمری میں قرآن مجید حفظ کیا ہے۔ کئی بار محراب سنا بھی چکے ہیں۔ یہاں دنیا اور دین کا صحیح امتزاج نظر آتا ہے۔ بالادستی دین کی اور دنیا حفظ دین و ایمان کا محض ایک وسیلہ حضرت سلطان المشائخ رحمت اللہ علیہ نے ایک بار ارشاد فرمایا "جو کچھ ضرورت سے زیادہ ہے دنیا ہے۔" ڈاکٹر صاحب کا اسی پر عمل ہے۔ ضرورت سے زیادہ نہ رکھو۔ خوش اور مطمئن رہو۔

اب میں اس مضمون کے سب سے مشکل حصے کی طرف آتا ہے۔ مشکل یوں کہ انسان جس چیز کو نہ جانتا ہو اس کے بارے میں خامہ فرسائی کرنے لگے تو مشکل بھی ہوگی اور فضیحت بھی۔ مگر جب اوکھلی میں سر دیا تو دھمکوں سے کیا ڈرنا۔ ڈاکٹر صاحب نقشبندی سلسلے کے بڑے بزرگ ہیں۔ مشائخ عصر میں ان کا شمار ہوتا ہے۔ ہزاروں مرید اور عقیدت مند ہیں جو ملک کے مختلف گوشوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ مشیخت اور بزرگی کا تذکرہ ہو تو لوگ فوراً" تصرفات روحانی کا بیان لے دوڑتے ہیں۔ ملتان کے ایک بزرگ نے جو حضرت سلطان المشائخ رحمت اللہ علیہ کے فیض یافتہ تھے حضرت والا سے التماس کی کہ لوگ مجھ سے کرامت طلب کرتے ہیں' میں کیا کروں۔ حضرت والا کا ارشاد ہوا۔ "سلوک کے سو درجوں میں سترھواں درجہ کرامت کا ہے۔ اگر تم سترھویں درجے پر قانع ہوگئے تو باقی تراسی درجے کیسے حاصل کرو گے۔" حضرت سلطان المشائخ رحمتہ اللہ علیہ ہی کا رشاد ہے کہ "جس طرح انبیاء پر معجزے کا اظہار فرض ہے۔ اسی طرح اولیاء پر کرامت کا اخفا فرض ہے۔ میری دانست میں ڈاکٹر صاحب کا سب سے بڑا تصرف اور کرامت ان کی سادہ اور پاکیزہ زندگی ہے۔ ان کا کمال

تربیت ہے جس سے ہزاروں طالبان علم اور سالکان راہ معرفت نے اپنی منزل کا تعین کیا ہے۔ وہ فیض جاریہ ہے جس سے اپنے بیگانے، چھوٹے بڑے سب یکساں طور پر مستفیض ہوتے ہیں۔ وہ حسن خلق اور حسن سیرت ہے جس سے لوگوں کے دلوں میں زندگی کا سلیقہ اور عرفان ابھرتا ہے۔ ویسے بزرگ محترم مولانا اصلح الحسینی ناقل ہیں کہ ایک محفل میں ڈاکٹر صاحب اور ان کے پیرومرشد دونوں تشریف فرما تھے۔ مگر ڈاکٹر صاحب ذرا دور بیٹھے تھے۔ حسینی صاحب کے دل میں یہ خطرہ گزرا کہ یہ کیسے مرید ہیں کہ پیر سے دور بیٹھے ہیں۔ ان کا بیان ہے کہ اس خطرے کا گزرنا تھا کہ ڈاکٹر صاحب معاً اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے پیرومرشد کے پاس جاکر بیٹھ گئے۔ ایک بار میں ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ تھا پیر کالونی کے بس اسٹاپ پر لمبی لمبی لائنیں لگی ہوئی تھیں۔ جب ہم ان لائنوں کے قریب سے گزرے تو ڈاکٹر صاحب نے ایک صاحب سے کہا کہ آپ اس لائن میں کیسے کھڑے ہوگئے۔ یہ بندر روڈ والی لائن نہیں۔ یہ کہہ کر آگے بڑھ گئے۔ میں نے لاکھ پوچھا مگر ڈاکٹر صاحب نے کوئی تشریح نہیں کی۔ اصل میں یہ باتیں تشریح کی ہیں بھی نہیں ؂

نظامی ایں چہ اسرار است کز خاطر عیاں کردی   کسے سرش نمی داند زباں درکش زباں درکش

ڈاکٹر صاحب سید زوار حسین شاہ علیہ الرحمہ سے بیعت ہیں۔ مجھے شاہ صاحب رحمت اللہ علیہ کی خدمت میں متعدد بار حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ نورانی چہرہ پاکیزہ شخصیت نہایت حاضر علم کے باوجود اظہار خیال میں محتاط۔ ایک بار میرے سامنے کسی صاحب نے کوئی مسئلہ دریافت کیا۔ شاہ صاحب رحمت اللہ علیہ نے احیاء العلوم کھولی اور ان سے فرمایا۔ سنو، امام غزالی رحمت اللہ علیہ کا اس سلسلے میں یہ خیال ہے۔ شاہ صاحب رحمت اللہ علیہ نے ڈاکٹر صاحب کی روحانی تربیت پر خصوصی توجہ فرمائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کا بڑا احترام فرماتے تھے اور بڑی قدر کرتے تھے۔ ایک بار شاہ صاحب رحمت اللہ علیہ حاجی محمد اعلیٰ صاحب کے یہاں قیام پذیر تھے۔ ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ میں بھی قدم بوسی کے لیے گیا۔ عصر سے بعد عشاء تک نشست رہی۔ مرشد کے حسب ارشاد نماز ڈاکٹر صاحب نے پڑھائی۔ مگر نہ جانے کیا بات تھی کہ نماز میں ڈاکٹر صاحب کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ نقشبندیہ سلسلہ علمی

وفور کا سلسلہ ہے کہ بزرگان سلسلہ نے بڑا گراں قدر تصنیفی اور تالیفی کام سرانجام دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب بھی اس سلسلۃ الذہب کے رکن رکین ہیں۔ ایں سلسلہ از طلائے ناب است۔

ڈاکٹر صاحب کے انوار احوال اور آثار کے بارے میں میرا کچھ عرض کرنا چھوٹا منہ بڑی بات ہے۔ بس اتنا ہے کہ ان کی خدمت میں حاضر ہوتا ہوں تو فرحت روحانی محسوس ہوتی ہے۔ اپنے آپ کو بھول جاتا ہوں۔ بہتر اور پاکیزہ دنیا کا تصور ابھرتا ہے۔ رہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ انسانیت کے بہتر مستقبل پر یقین کرنے کو جی چاہتا ہے۔

"آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے"

آں کہ من دانم و داند دلِ من

ڈاکٹر نجم الاسلام

۱۔ خدمات زبان و ادب کے اعتبار ہی سے نہیں، سیرت و کردار کے لحاظ سے بھی ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی شخصیت عظمت کے بہت سے پہلو رکھتی ہے۔ یہ میرے لیے ایک بڑے اعزاز کی بات ہے کہ انجمن کی اس تقریب میں ڈاکٹر صاحب کے بارے میں ایک مختصر مضمون پیش کر رہا ہوں۔

۲۔ اس مضمون کا سرنامہ حالؔی کے ایک شعر کو بناتا ہوں جو ڈاکٹر صاحب پر بالکل صادق آتا ہے۔

؎ سلف کی دیکھ رکھو راستی و راست اخلاقی کہ ان کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی

۳۔ اب میں اصل مضمون کی طرف آتا ہوں اور ڈاکٹر صاحب کی شخصیت اور خدمات کے بارے میں چند تاثرات اور مشاہدات پیش کرتا ہوں۔ پہلی اور سب سے نمایاں بات یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک کثیر الجہات شخصیت ہیں۔ تاہم توازن حیرت انگیز طور پر قائم رکھا ہے۔ عالم، معلم، مصنف، محقق، نقاد، مصلح، سالک، عابد، صلاح کار اور کیا کچھ نہیں۔ کثرت

سے سفر کرنے والے۔ اب تو نہیں مگر کچھ عرصہ پہلے تک بہت سفر کیے ہیں۔ ضرورتاً" شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔ قطعات تاریخ کی حد تک' اور کھرا شعر کہتے ہیں۔ طب سے بھی لگاؤ ہے۔ خدمت خلق کے لیے مشورہ بھی دے دیتے ہیں۔ دستیاب ہو تو دوا بھی۔ مخلوق خدا طرح طرح کے مقاصد لے کر کثرت سے رجوع کرتی ہے۔ مگر علمی مشاغل پوری باقاعدگی سے جاری رہتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے وقت میں بڑی برکت ہے۔

۴۔ ڈاکٹر صاحب کثیر اللسان بھی ہیں۔ اردو اور فارسی پر تو وہ سند ہیں۔ عربی بھی خوب آتی ہے۔ قرآن مجید کی آیات ازبر ہیں۔ انگریزی خوب لکھتے ہیں۔ بول بھی لیتے ہیں۔ ایک زمانے میں ڈگری کلاسوں کو انگریزی پڑھاتے بھی تھے۔ ہندی اور سندھی سے بھی بہ قدر ضرورت واقف ہیں۔ چھ زبانیں آتی ہیں اور اپنے علمی تصنیفی کاموں میں اس واقفیت سے پورا فائدہ بھی اٹھایا ہے۔

۵۔ کثیر التصانیف بھی ہیں۔ مطبوعہ کتابوں کی تعداد ساٹھ سے اوپر ہو گئی ہے۔ جو لکھا' بفضلہ چھپ بھی گیا۔ بیشتر کتابوں کی صورت میں' کچھ رسائل میں۔ مطبوعہ مقالات کی ایک تعداد اب بھی کتابی صورت میں لائی جانی ہے۔ ان میں ۴۰ اوہ مقالات بھی ہیں جو دائرہ معارف اسلامیہ پنجاب یونی ورسٹی میں کنٹری بیوٹ کیے گئے ہیں۔ اکثر کتابیں خود ہی چھپوا دیں۔ کچھ ایسی بھی ہیں جو ناشرین نے چھاپی ہیں' از خود چھاپی ہیں۔ کسی ناشر سے کہا نہیں کہ ہماری کتاب چھاپو۔ چھپ گئی تو اس پر تبصرے لکھوانے کے جتن نہیں کیے۔ یہ اللہ کا ایک بڑا کرم رہا کہ اس معاملے میں کسی کے سامنے شرمندہ نہیں ہیں۔ مطبوعات کا یہ سلسلہ اب بھی عمر عزیز کے ۶۷ ویں برس میں بھی اسی صبر و سکون سے جاری ہے۔ چنانچہ اسی سال ۱۹۸۸ء کی جنوری میں "دیوان میرزا مظہر جان جاناں مع خریطۂ جواہر" اپنے مقدمے کے ساتھ چھپوایا ہے۔ ایک کتاب "ہمہ قرآن در شان محمد" اور مقالات کا ایک مجموعہ زیر کتابت ہے۔

۶۔ دل سے قدر کرنے والوں اور اچھا کہنے والوں کی ایک کثیر تعداد ہے جو ڈاکٹر صاحب کے حق میں دست بہ دعا ہے۔ معاصر فضلا' تلامذہ' مریدین' متوسلین' عقیدت مند' جو ایک بار ملتا ہے وہ بھی' جو تیس' چالیس' پچاس برس کا شناسا ہے وہ بھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کے انعاموں میں سے ایک انعام ہے جو ایک اچھے طریقے پر استقامت کے ساتھ ساری زندگی گزارنے

والوں کو ملتا ہے۔ یونہی حاصل نہیں ہو جاتا۔ ڈاکٹر صاحب نے برصغیر کے تین کالجوں اور تین یونی ورسٹیوں میں مجموعی طور پر ۳۵، ۴۰ برس پڑھایا ہے۔ خوبی اور نیک نامی کے ساتھ پڑھایا ہے۔ تلامذہ کی ایک کثیر تعداد ہے۔ کم و بیش اتنے ہی عرصے سے لوگوں کو خیر و ایمان کی صلاح بھی دے رہے ہیں۔ عقیدت مند بھی کچھ کم نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کسی دور دراز علاقے میں بھی چلے جائیں تو کوئی نہ کوئی شاگرد یا عقیدت مند نکل ہی آتا ہے اور کس عقیدت، محبت اور اخلاص سے ملتا ہے۔ یہ صورت حال آج کے اساتذہ سے کس قدر مختلف ہے جو حفظ حرمت کی دعا مانگتے ہیں۔

۷۔ شخصی خوبیاں تو ڈاکٹر صاحب میں بہت سی ہیں۔ جو خوبی سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب ایک متحمل مزاج انسان ہیں۔ شاگرد، رفقاء احباب، عقیدت مند، اعزا، متوسلین، بڑے چھوٹے، غرض کہ جو جہاں ہے میں نے سب کے ساتھ تحمل کا برتاؤ ہی کرتے پایا ہے۔ حالانکہ واسطہ تو کیسے کیسے تحمل شکن افراد کے ساتھ رہا ہے۔

۸۔ اسی تحمل کے سبب ڈاکٹر صاحب کو روک ٹوک اور نصیحت فضیحت کرتے بھی کم ہی دیکھا ہے۔ ہم اساتذہ اکثر اس مین مبتلا ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ع آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو۔ نتیجہ الٹا نکلتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا طریقہ کس قدر الگ ہے۔ وہ یہی کام اپنے مثبت عمل سے لیتے ہیں۔ ان کا طرز عمل، کردار، انداز حیات اپنے اندر ایک خاموش تبلیغی صفت رکھتا ہے۔ جس کا مثبت اثر ظاہر ہوتے بارہا دیکھا ہے۔

۹۔ علمی کاموں میں دوسروں کی حوصلہ افزائی اور ان سے تعاون کے معاملے میں ہمارے بعض فضلا ویسی وسیع قلبی کا مظاہرہ کم ہی کرپاتے ہیں جیسی کہ توقع رکھی جاتی ہے۔ مگر میں نے اس معاملے مین بھی ڈاکٹر صاحب کو نہایت وسیع القلب اور دوسروں کا لحاظ رکھنے والا (Considerate) پایا ہے۔

۱۰۔ تلامذہ کی علمی تربیت میں بھی ڈاکٹر صاحب کا طریقہ کچھ ایسا ہی رہا ہے۔ مثبت طور پر حوصلہ افزائی اور تعاون کا طریقہ جس کی بدولت مقدار و معیار دونوں لحاظ سے اتنا بہت سا تحقیقی کام ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں پایہ تکمیل کو پہنچا ہے اور اتنے بڑے پیمانے پر تلامذہ نے فیض پایا کہ معاصر فضلا میں مشکل ہی سے اس کی نظیر ملے گی۔

۱۱- علمی اور تحقیقی کاموں کو وسعت اور گہرائی کے ساتھ انجام دینے کے لیے ایک خاص انداز پر زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ دنیا کی بہت سی دلچسپیوں اور ضرورتوں پر علمی اور تحقیقی ضرورتوں کو فوقیت دیے بغیر اس میدان میں کامیابی کا امکان ہی نہیں۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک خاص طرح کا لائف اسٹائل ہے جسے اختیار کرنا پڑتا ہے۔ ہمارے بہترین علماء اور محققین نے اسی طور پر اپنی زندگیاں گزاری ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کا لائف اسٹائل بھی ان کے علمی و تحقیقی کاموں کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے اور اپنے اندر ایک مثال رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی علمی زندگی کے شروع ہی میں تحقیقی سرگرمیوں کو اپنا مرکز و محور بنا لیا تھا' اور اس کے لیے ضروری طور پر خود کو تیار کیا۔ فضلائے وقت سے استفادہ' برصغیر کی اکثر بڑی لائبریریوں تک رسائی' علمی اسفار' علمی اور تحقیقی کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی مستعدی اور انہماک' حوالے کی کتابوں کا ایک ذاتی ذخیرہ تاریخ و ادب کے ضروری مصادر تک رسائی' اپنے موضوع پر عبور ---------- تحقیق کے یہ سب بنیادی لوازم ڈاکٹر صاحب نے اپنی علمی زندگی کے ابتدائی دور ہی میں یکجا کر لیے تھے۔

۱۲- کتابوں کا ایک اچھا اور تحقیقی کاموں میں خاصا مفید و مددگار ذخیرہ ڈاکٹر صاحب کے پاس ہے۔ جس تک اکثر تلامذہ اور رفقا کی رسائی رہی ہے۔ اس میں کتابیں ضائع بھی ہوئیں لیکن وسیع القلبی کے ساتھ یہ فیضان اب بھی جاری ہے۔

۱۳- چند خوبیاں اور بھی ہیں جو بہت نمایاں ہیں۔ یکسوئی غضب کی ہے۔ باوجودیکہ مصروفیات متنوع اور کثیر ہیں۔ علمی کاموں میں یکسوئی برقرار رہتی ہے۔ حافظہ نہایت قوی ہے۔ گو کہ اب کبھی کبھی نسیاں کا عذر کرتے ہیں۔ لیکن علمی مسائل میں تو قوت حافظہ الحمد اللہ ویسی ہی قوی ہے جیسی کہ تھی۔ کاموں کو جلد نمٹانے کی عادت بھی ایسی ہے کہ شاید وباید۔ معاملہ دفتری ہوا تو فی الفور جواب دے دیا۔ تصنیفی کام ہوا تو اپنے وقت پر بلکہ جلد تر' پایہ تکمیل کو پہنچا لیا۔ "اقبال اور قرآن" کم و بیش ہزار صفحے کی کتاب تھی۔ چند ماہ میں مکمل کر لی۔ اتنی بہت سی کتابوں پر نظر ثانی کی۔ مقالات کی درستی کی۔ جلد اور پہلی فرصت میں کی۔ مراسلات کا جواب ہوا تو فوراً "گیا' کسی سے کتاب مستعار لی تو استعمال کے بعد واپسی میں عجلت کی۔ غرض کہ انگریزی محاورے میں یوں کہیے کہ ڈسپوزل بہت کوئک ہے۔

۱۴- ان بہت سی خوبیوں نے مل کر ڈاکٹر صاحب کو عام زندگی میں ایک بہت پسندیدہ اور قابل تقلید شخصیت کی حیثیت سے اور علمی دنیا میں ایک کثیر التصانیف عالم و محقق کی حیثیت سے ایک ایسے بلند و بالا مقام پر پہنچایا ہے کہ وہ ہمارے لیے ایک روشن مینارہ نور ہیں۔ ان کے علمی تحقیقی اصول اور طریقے وہی پسندیدہ اصول اور طریقے ہیں جو علمائے سلف کے تھے اور ان کے اپنے دور میں شبلی، شیرانی، سلیمان ندوی، شروانی اور ڈاکٹر مولوی محمد شفیع کے اصول اور طریقے رہے ہیں۔ اپنی تحقیقات میں ڈاکٹر صاحب نے تاریخ کا خاص لحاظ رکھا ہے اور فارسی، انگریزی ماخذوں سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔ میں یہاں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا، اور مقصد ڈاکٹر صاحب کی کتابوں پر اظہار خیال بھی نہیں۔ لیکن یہاں ڈاکٹر صاحب کے ایک علمی و تحقیقی رویے کا ذکر کرنا مناسب ہوگا جو ان کے تلامذہ کے لیے ایک نمونہ ہے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے ایسے تحقیقی مقالوں میں جو کسی کے رد میں لکھے گئے ہوں اس فاضل کا نام ظاہر کرنا پسند نہیں فرماتے۔ چنانچہ اپنے معرکہ آرا تحقیقی مقالے ''مجدد الف ثانی پر حرف گیری کا جائزہ'' میں یہی طریقہ اپنایا۔ وہ اپنے تلامذہ کو بھی اسی پر کاربند دیکھنا چاہتے ہیں۔ کیوں کہ مقصد تو غلط فہمی کا ازالہ یا غلط بیانی کی تردید ہے نہ کہ کسی خاص شخصیت کو گرانا۔

۱۵- فن املا کے سلسلے میں ڈاکٹر صاحب ڈاکٹر عبدالستار صدیقی کے طریقے پر کاربند ہیں۔ اسی طریقے کی پیروی ڈاکٹر صاحب کے اثر سے ان کے تلامذہ کی ایک کثیر تعداد استقامت کے ساتھ کر رہی ہے۔

۱۶- چند اولیات بھی ہیں جو ڈاکٹر صاحب کے حصے میں آئی ہیں۔ تحدیث نعمت کے طور پر اگر وہ خود بھی زبان پر لائیں تو روا ہے اور میرے لیے تو ضروری ہے اس موقع پر بیان کروں۔ برصغیر کی تین جامعات کے اردو نصابوں کی تیاری میں ڈاکٹر صاحب نے بھرپور حصہ لیا ہے اور ان میں خصوصیت کے ساتھ اقبالیات اور اسلامیات کو قرار واقعہ حصہ دلایا ہے۔ فن املا کی تاریخ اور اصلاح زبان و املا کو نصاب کا حصہ بنانے میں بھی انہوں نے پہل کی ہے۔ ایم اے کی سطح پر اب تو برصغیر کی بہت سی یونی ورسٹیوں میں تحقیق کے اصول اور طریق کار کی تعلیم دی جا رہی ہے۔ مگر اس ضرورت کو ڈاکٹر صاحب نے سب سے پہلے محسوس کیا۔ چنانچہ اس موضوع پر اپنے مقالے ''فن تحقیق'' کی صورت میں اردو میں قابل مطالعہ مواد

پیش کرنے میں اور ایم اے اردو کے نصاب میں فن تحقیق کے اصول اور طریق کار کا پرچہ داخل کرنے میں ان کو اولیت حاصل ہے۔ اسی طرح اردو کے نصاب میں ابتدائی عربی اور ابتدائی فارسی کا پرچہ شامل کرانے میں بھی وہ اولیت رکھتے ہیں۔ علیٰ ہذا نعتیہ شاعری کو اردو نصاب میں نمایاں طور پر داخل کرنے میں اور نعتیہ مشاعروں کو شعبہ جاتی غیر نصابی سرگرمیوں کا حصہ بنانے میں بھی پہل ڈاکٹر صاحب ہی نے کی تھی۔ پی ایچ ڈی کے مقالات کی نگرانی اور اسکالر صاحبان کی رہنمائی بھی سب سے زیادہ ڈاکٹر صاحب نے کی ہے۔ اس باب میں کوئی ان کا ہمسر نہیں۔ مغرب میں گب قریب آتا ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نگرانی کے کام میں ابھی مصروف ہیں اور بہت آگے نکل جائیں گے۔ "اردو اور قرآن" کے حوالے سے پی ایچ ڈی کے معیار کا سب سے زیادہ اور باہم دیگر مربوط کام بھی ڈاکٹر صاحب ہی کی نگرانی میں تکمیل کو پہنچا ہے اور یہ ایک بڑی علمی خدمت ہے جو ڈاکٹر صاحب کے ذریعے انجام پائی ہے۔

۱۷۔ آخر میں ڈاکٹر صاحب کی خدمات جلیلہ کے اعتراف میں منظوم خراج عقیدت پیش کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں۔

بعنوان خراج ذکر منظوم استاذی و مشفقی و مخدوم

نام ان کا غلام مصطفےٰ خاں کام ان کا صلاح خیر و ایماں

اخلاق ہے بے مثال ان کا ہے سب پہ عیاں کمال ان کا

اوصاف سلف کا آئینہ ہیں مینارۂ نور اتقا ہیں

قاری، عالم، ادیب، نقّاد اس دور کے اک عظیم استاد

تحقیق ہے خاص کام ان کا اس فن میں بڑا ہے نام ان کا

حالی کا جو ذہنی ارتقاء ہے کیا اچھے طریقے پر لکھا ہے

بہرام و حسن پہ وہ کیا کام سب معترف اس کے خاص اور عام

ثابت کیا اک کتاب لکھ کر اردو کے اثر کو فارسی پر

نایاب مجددی رسائل چھپوائے باہتمام کامل

اقبال کی شاعری کا رشتہ قرآن مجید سے ملایا

انمول کتابیں ان کے گھر ہیں شاگرد بھی جن کے بہرہ ور ہیں
برسوں سے یونہی بہ فضل باری ہیں ان کے فیوض علم جاری

استاد محترم

ڈاکٹر نظر کامرانی

درمیانہ قامت، گندمی رنگت، کشادہ پیشانی، روشن آنکھیں، دہرا بدن، گھنی ڈاڑھی جس میں صبح و شام کا حسین امتزاج، زبان شستہ، لہجہ رفتہ، لباس مخصوص، ترکی ٹوپی اور اب سادہ کپڑے کی ٹوپی استعمال کرنے لگے ہیں۔ شیروانی جس کے بٹن سردی ہو یا گرمی ہر موسم میں بند۔ چوڑے پائنچوں کا پاجاما ٹخنوں سے اونچا۔ ہلکا جوتا لہجے میں چھوٹوں کے لیے ملائمت بڑوں کے لیے تمکنت۔ چال ایسی جیسے مخمل پر چل رہے ہوں۔ نہ سختی سے قدم اٹھے نہ تیزی سے بڑھے۔ یہ تمام خصوصیات اگر آپ کو اس نفسانفسی کے دور میں نظر آجائیں تو آپ یقین کرلیں کہ یہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں ہیں۔

آپ اجنبی ہوں یا برسوں کے شناسا۔ جب بھی گفتگو کریں گے آواز میں نرمی ہوگی اور لہجے میں شیرینی۔ انداز گفتگو میں اپنائیت بھی سنائی دے گی اور یگانگت بھی۔ معلوم ہی نہیں ہوگا کہ آپ جس شخص سے مخاطب ہیں یہ شخص علی گڑھ کا تعلیم یافتہ ہے۔ پی ایچ ڈی بھی اور ڈی لٹ کی ڈگری بھی رکھتا ہے۔ خطابت سے پتہ نہ چلے گا کہ یہ شخص اتنا تعلیم یافتہ ہے بلکہ ایسا معلوم ہوگا کہ کوئی ہم میں سے ہے جو ہماری باتیں نہیں سنجیدگی اور سادگی کے ساتھ ہم سے بیان کررہا ہے۔

ڈاکٹر صاحب اس تاریکی میں جہاں غیروں کو تو کیا اپنوں کو پہچاننا مشکل ہو رہا ہے مینارۂ نور کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ باتوں ہی باتوں میں کام کی باتیں کرجاتے ہیں۔ انداز بیان اتنا پیارا جیسے صبح کی ہوا چل رہی ہو۔ آواز اور لہجہ ایسا دلکش جیسے جھرنے سے پانی بہہ رہا ہو۔

یہ بات کوئی ۲۰ - ۲۲ سال پہلے کی ہے۔ جب میں نے گریجویشن کیا تھا اور اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں گھر میں ہی بہت سارے مسائل پیدا ہوگئے تھے۔ بھائی صاحب بینکار بنانا چاہتے تھے، احباب کا خیال تھا کہ امریکہ جاؤں۔ ذاتی رائے تھی کہ ادب و صحافت کی پرخار راہوں میں قدم رکھو۔ آخر کار بات یہاں تک پہنچی کہ میں نے شعبہ اردو میں داخلہ لے لیا۔ جب والدہ صاحبہ کو علم ہوا تو انہوں نے دعا دی کہ تمہاری دنیا کے ساتھ آخرت بھی سنورے۔

اہل دل نے کہا۔ اب تو دنیا بھی سنوری اور دین بھی محفوظ ہوا۔ اور واقعی والدہ صاحبہ کی دعا قبول ہوئی۔ ہم نے دین بھی پایا اور دنیا بھی۔ اور میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ سب ڈاکٹر صاحب کی تعلیم کے ساتھ تربیت کا اثر ہے۔

ڈاکٹر صاحب راست گفتار، نیک دل انسان ہیں۔ جو بات ان کے دل میں ہوتی ہے وہی ان کی زبان پر آتی ہے۔ اپنے انداز میں سوچتے ہیں اور اپنے ہی انداز میں جواب دیتے ہیں۔ آپ کی زندگی کا ہر رخ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کی ہدایات کے عین مطابق ہے۔ آپ کا ہر قدم اس راستے کی جانب اٹھتا ہے جس کی نشاندہی حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمائی۔

ادب کی دنیا میں آپ کا نام بھی ہے اور کام بھی۔ انگریزی، عربی، فارسی، اردو اور مذہب اسلام کے جید عالم ہیں۔ محقق ہیں۔ مترجم ہیں۔ ان کی لاتعداد کتابیں ہیں۔ جن میں علم و ادب بھی ہے۔ قرآن کا تذکرہ بھی ہے اور مطالب قرآن بھی۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے اسوہ حسنہ کا بیان بھی ہے اور مجدد الف ثانی کے کارناموں کا ذکر بھی۔ غرض یہ کہ آپ نے تمام موضوعات کا حق ادا کیا ہے۔

آپ ہر مسئلے کا حل قرآن و سنت کی روشنی میں تلاش کرتے ہیں اور تعلیم سے زیادہ تربیت پر زور دیتے ہیں۔

برصغیر کے علاوہ آپ کی شہرت دنیا کے دوسرے حصوں میں بھی پھیلی ہوئی ہے۔ ایک مرتبہ جامعہ ازہر "قاہرہ" کے منتظمین نے ڈاکٹر صاحب سے کتابوں کے سلسلے میں معلومات حاصل کیں کہ نصاب میں کون سی کتب شامل کی جائیں۔ صاحب موصوف نے نہایت مختصر جواب ارسال کیا۔

> "آپ کورس میں جو کتابیں چاہیں شامل کرلیں لیکن اساتذہ کا انتخاب اتنا اچھا کیجیے کہ وہ تعلیم سے زیادہ تربیت کا خیال رکھیں۔ تربیت اچھی ہو تو کتابیں خود شاگرد تلاش کرلیتی ہیں۔"

سندھ یونی ورسٹی کے قیام کے موقع پر ڈاکٹر علامہ آئی آئی قاضی صاحب نے سندھ یونی ورسٹی

میں اساتذہ کی اتنی اچھی ٹیم کو یکجا کرلیا تھا جس پر سندھ یونی ورسٹی آج تک فخر کرتی ہے۔ اس واقعہ کے راوی خود قاضی صاحب تھے۔ آپ نے فرمایا۔

"جب جامعہ سندھ میں شعبہ اردو کے لیے صدر شعبہ کی تلاش ہوئی تو ہماری نگاہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب پر ٹھیری۔ آپ کو ہندوستان سے ہجرت کیے ہوئے چند سال ہوئے تھے اور ابھی آپ پوری طرح سیٹ بھی نہ ہوپائے تھے۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ آپ روزانہ سائکل پر پیر الٰہی بخش کالونی سے اردو کالج تک جاتے تھے اور جب ایک روز اردو کالج کے چپراسی نے ڈاکٹر صاحب سے سائکل کی ضرورت کا تذکرہ کیا تو ڈاکٹر صاحب نے اپنی اکلوتی سائکل کالج کے چپراسی کے حوالے کردی کہ اس کی ضرورت مجھ سے زیادہ تم کو ہے۔ کیوں کہ تم میرے مقابلے میں بہت دور سے آتے ہو۔ اور خود بس پر آنے لگے۔ ان ہی دنوں میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ سندھ یونی ورسٹی آجائیں۔ یونی ورسٹی نئی نئی بنی ہے۔ جو بنیادیں اس وقت رکھ دی جائیں گی وہ مستقبل کے لیے کارآمد اور سودمند ہوں گی۔ اگر بنیادیں گہری اور مضبوط ہوں گی تو عمارت سیدھی کھڑی ہوگی۔ ہم نے وہ تمام سبز باغ بھی دکھائے جو تقاضائے وقت میں شامل تھے۔ رہائش کا کوئی مسئلہ نہ تھا۔ یونیورسٹی گھر سے نہایت قریب۔ تنخواہ حد درجہ معقول۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے انکار کردیا۔ فرمایا۔ اس وقت میری ضرورت وہاں سے زیادہ یہاں ہے۔ میں حیدر آباد واپس لوٹ گیا۔ لیکن مجھے خواب میں ہدایت ملی۔ غلام مصطفیٰ کو یہاں لے آؤ۔ اور

میں نے جواب دیا۔ وہ تو انکار کر چکے ہیں۔ حکم ہوا۔ اب جاؤ، کامیاب لوٹو گے۔ میں صبح اٹھا اور پھر کراچی روانہ ہو گیا۔ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کی۔ رات کے خواب کا حوالہ دیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔ میں تیار ہوں۔ مجھے بھی ہدایت مل چکی ہے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کراچی سے سندھ یونی ورسٹی پہنچ گئے۔"

اور سندھ یونی ورسٹی میں جب تک اساتذہ کے انتخاب میں دیانت داری برتی گئی کوئی مسئلہ وہاں سر نہ اٹھا سکا۔

ڈاکٹر صاحب کے شعبہ میں کبھی بھی سوسائٹی کے انتخاب نہیں ہوئے۔ ہمیشہ نامزدگیاں ہوتی رہیں۔ ڈاکٹر صاحب خود اس خوش اسلوبی سے نامزدگی فرماتے کہ کسی کو شکایت کا موقع نہ ملتا اور سال بھر تمام تقریبات بہ حسن و خوبی انجام پاتیں اور آج یہ عالم ہے کتابوں اور قلم کی بجائے طلبہ کے ہاتھ میں کلاشنکوف اور کارتوس کے میگزین ہیں۔

آج میں جس منصب پر فائز ہوں اس کے فرائض میں اساتذہ کا انتخاب بھی شامل ہے اور میں یہ بات نہایت فخر سے کہہ سکتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کی ہدایت کی روشنی میں مجھے اساتذہ کے انتخاب میں کوئی دشواری نہیں ہوئی۔ میں ڈاکٹر صاحب کے حکم کے مطابق اساتذہ کا انتخاب کرتا ہوں۔ اپنے پاس بلوا کر نہیں بلکہ ان کے دولت کدے پر جا کر ان سے درخواست لے کر، خود درخواست پیش کر کے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں اساتذہ نے اس بدنظمی اور انتشار کے دور میں ایک ذمہ داری نبھانے کی نئی مثال قائم کی ہے۔ میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر ہم ڈاکٹر صاحب کے اس حکم کو عملی جامہ پہنائیں تو حال بھی منور اور مستقبل بھی محفوظ۔

مجھے یہ اعزاز حاصل ہے کہ میں نے عمر کا ایک حصہ ڈاکٹر صاحب کے قدموں میں بیٹھ کر گزارا ہے۔ ڈاکٹر صاحب ان ہستیوں میں سے ہیں جن کے شاگرد احترام کی وجہ سے ان سے ہم کلام ہونے میں احتیاط برتتے ہیں۔ میرا تو ذکر ہی کیا جب ڈاکٹر صاحب ناگ پور یونی ورسٹی میں پڑھا رہے تھے تو اس کے ایک ماہ بعد میں نے اس جہان رنگ و بو میں قدم رکھا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کی تقریر و تحریر میں ہم نے جو اعتدال اور سادگی پائی ہے وہ اعتدال اور سادگی بہت کم لوگوں میں دیکھی۔ سادگی اور اعتدال سے ڈاکٹر صاحب کی زندگی عبارت ہے۔ اسلام' اسوۂ حسنہ' شریعت اور طریقت اور حُب اسلام پر جب بھی گفتگو ہوگی تو آپ کے سامنے جو نقوش ابھریں گے وہ ڈاکٹر صاحب کے ہوں گے۔

ہم نے خطابت میں دریا بہانے والوں کو بھی دیکھا ہے اور وہ منظر بھی دیکھا ہے کہ خطابت کا دریا خطیب کو لے ڈوبا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب تقریر کے معاملے میں دریا بہانے کے قائل نہیں۔ آپ کی تقریر میں ہر وقت ٹھنڈے پانی کے چشمے ابلتے رہتے ہیں جو سامع کی پیاس بھی بجھاتے ہیں اور زندہ رہنے کا سلیقہ بھی سکھاتے ہیں اور شناوری سے آگاہی بھی بخشتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب سے روزانہ سینکڑوں افراد ملاقات کرتے ہیں۔ اور ان ملاقاتیوں میں آپ یہ اندازہ لگانے میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتے کہ کون ڈاکٹر صاحب سے کتنا قریب ہے۔ ان کے ہاں وزیر بھی آتے ہیں اور فقیر بھی۔ عالم بھی ملتے ہیں اور جاہل بھی۔ استاد بھی ملتے ہیں اور شاگرد بھی۔ یہ تمام آپ کو ایک ہی صف میں نظر آئیں گے۔ آپ کو محمود یہاں ملے گا اور ایاز بھی مگر وہ سب ایک ہی صف میں بیٹھے نظر آئیں گے۔ آپ کے پاس سب کے لیے ایک جیسا خلوص' ایک جیسی محبت' ایک ہی نگاہ کرم' ایک ہی انداز گفتگو نظر آئے گا۔ اور یہی وجوہات ہیں کہ آپ کے ہاں صبح سے شام تک ضرورت مندوں کا ہجوم رہتا ہے۔

آپ کی زندگی تکلف سے دور اور اتنی سادہ ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ آپ ایک روز کے قیام کے لیے یہاں ہیں۔ کل سفر پر روانہ ہونا ہے۔ ایک چارپائی جو گدے سے بے نیاز جس پر ایک ہلکی سی چادر' ایک ہلکا سا تکیہ' برابر میں ایک تپائی' کتابیں بہت ہیں۔ "پچاس ہزار" لیکن شوکیس میں نہیں۔ بلکہ یہ بھی نہیں معلوم وہ مکان کے کس کونے میں ہیں۔ لیکن جو رسالہ یا کتاب آپ طلب کریں گے بغیر تاخیر کے خود پیش کریں گے۔ یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔

سادگی اور عاجزی کا یہ عالم ہے کہ سلام میں ہمیشہ پہل کریں گے۔ مسکراہٹ ہر وقت چہرے پر پہرہ دیتی ہوئی ملے گی۔ آنکھیں ملیں اور مسکراہٹ نے آپ کے دل و دماغ پر گلاب

پاشی کی۔ اور پھر آپ اس مسکراہٹ کے حصار میں گرفتار ہوئے۔ اور اس شخصیت کے پرستار ہوئے۔

آپ بولتے کم ہیں۔ لیکن جب بولتے ہیں' موتی رولتے ہیں۔ قلم میں لطافت' زبان میں شرافت اور ذہن میں فراست۔ کسی کے خلاف قلم اٹھاتے نہیں۔ اور دل شکنی دشمن کی بھی پسند نہیں۔ اپنوں کا تو ذکر ہی کیا۔ کوئی کتنی ہی بے شرمی اور بے حیائی سے انہیں دھوکا دے۔ بڑی شرافت اور خلوص سے دھوکا کھاتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ دھوکہ دینے والے کو محسوس بھی نہیں ہونے دیتے کہ انہیں کیا معلوم ہے اور کیا نہیں۔

کئی حج کر چکے ہیں اور حج پر جاتے ہیں تو صرف ایک سفید بیگ جو کندھے پر پڑا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ سفر کرتے ہیں۔ اس کے باوجود سینکڑوں کی فرمائشیں پوری کرتے ہیں۔ اور لاکھوں کی سفارش۔ کام ہوجائے تو خوش ہوتے ہیں۔ کام نہ ہونے پر بے قرار رہتے ہیں۔

زندگی کے تجربات بلا تکلف بیان کرتے ہیں اور تجربات کی روشنی میں دین و دنیا سنوارنے کے طریقے سمجھاتے ہیں۔ باتوں باتوں میں وہ نصیحت کرتے ہیں کہ جو مقرر اپنی گھنٹوں کی تقریر میں بھی نہیں کرپاتے۔ وجہ یہ ہے کہ آپ گفتار کے نہیں کردار کے غازی ہیں۔ انہیں نہ اقتدار کی ہوس ہے نہ صاحبان اقتدار سے قریب ہونے کا شوق۔ نہ انہیں نام و نمود سے واسطہ ہے اور نہ شہرت کی طلب۔ وہ اپنے جہان علم و دانش میں مست و مگن ہیں۔

ڈاکٹر صاحب میں جو استغنا ہے' جو بے نیازی ہے' جو نرمی و ملائمت ہے جو اعتدال و توازن ہے۔ وہ صرف ان کا اور صرف ان ہی کا حصہ ہے۔ یہ بیش بہا دولت ان کی ہے جو خود انہوں نے دونوں سے اپنے شاگردوں میں لٹائی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کو انعامات و اعزازات کی کبھی خواہش نہیں رہی۔ نہ ڈاکٹر صاحب نے ان کے پیچھے بھاگ کر اپنے آپ کو ہلکان بلکہ یہ انعام و اکرام ڈاکٹر صاحب کے پیچھے بھاگ بھاگ کر ہلکان ہوتے رہے۔ یہ انعام و اکرام ڈاکٹر صاحب کے لیے باعث افتخار نہیں بلکہ انعامات و اکرام کے لیے یہ باعث عزت و افتخار ہے کہ وہ ڈاکٹر صاحب کے لیے چنے گئے۔ ادبی و سرکاری' کئی انعامات حاصل کر چکے ہیں۔ لیکن نہ کبھی اس کا تذکرہ کیا۔ نہ زیر قلم لائے۔ وہ یقیناً "دنیائے ادب کے صوفی و قلندر ہیں۔ ان کا مسلک دنیا میں علم و آگہی کا فروغ ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے نسلوں کی ذہنی تربیت کی اور اپنے مخصوص انداز میں لاکھوں ذہنوں کو جلا بخشی ہے۔

آج کے لوگوں کے لیے یہی بہت بڑی بات ہے کہ ہم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے دور میں سانس لے رہے ہیں۔ انہیں دیکھا ہے اور ان کے قدموں میں بیٹھے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تعلیم و تربیت کا سایہ ہمارے سروں پر قائم رکھے۔

ڈاکٹر صاحب کے بارے میں میری کیا مجال کہ اظہار خیال کروں۔ بس اتنا جانتا ہوں۔ ان کے قول و عمل میں ذرہ برابر بھی فرق نہ پایا۔ عملی زندگی میں بھی ویسا ہی پایا۔ جیسا تحریر و تقریر میں معتبر، باوقار، دیانت دار اور مصلحت سے بے نیاز۔

ڈاکٹر صاحب جیسی قابل احترام شخصیتوں کے قدموں میں چند ساعتیں گزارنے کی سعادت بڑی نعمت ہے اور میں اپنے آپ کو خوش قسمت تصور کرتا ہوں کہ مجھے یہ نعمت نصیب رہی اور آج بھی میرا مقدر ہے۔

حضرت مولانا ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب دامت برکاتہ کے اعزاز میں ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب اپنی عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب

استاذ الاساتذہ

استاذ الاساتذہ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب، ان نابغۂ روزگار ہستیوں میں سے ایک اور ممتاز ہیں جن پر نہ صرف ہم سب فخر کرتے ہیں۔ بلکہ آنے والی نسلیں بھی فخر کریں گی۔ وہ جامع الصفات ہیں۔ ایک ہی ذات میں اتنی صفات کا یکجا ہو جانا ایک ایسا کمال ہے جو اس دور میں کم کم دیکھنے میں آتا ہے۔ وہ عظیم استاد ہیں۔ ایسے فاضل اور شفیق استاد جن کی مثال اس دور میں نہیں ملتی۔ ان کے شاگرد اس برصغیر اور بیرونی ممالک میں افق علم و ادب پر چھائے ہوئے، گیسوئے زندگی کو اس طور پر سنوار رہے ہیں کہ استاد کا فیض معاشرے کو

روشن و منور کر رہا ہے۔ ایسے محقق و مفکر کہ ان کی تحقیقات نے ادب و فکر کے در و بام پر اجالا کیا ہے۔ ایسے قطب اقطاب اور ایسے بزرگ ولی اللہ کہ ہزاروں لاکھوں گم کردہ راہ کو راستی کی طرف موڑ کر ان کی زندگی کو نیکی کے راستے پر لگایا ہے۔ جس پر توجہ کی پارس بن گیا۔ جسے نظر کیمیا اثر سے دیکھ لیا کندن ہو گیا۔ روشن آنکھیں' شگفتہ و خنداں نورانی چہرہ' صاف دھیما لہجہ دل میں اتر جانے والا' باتیں جیسے گلوں کی خوشبو' کم سخن لیکن ہر سخن میں معنی کا ایک دریا جب کبھی لقمہ بنا کر اپنے ہاتھ سے کھلایا اس کی لذت کام و دہن کا مستقل مزا بن گئی۔ چشمہ فیض ایسا کہ ہر دم جاری ہے جو آیا شاد کام گیا۔ بیمار آیا صحت مند گیا۔ درماندوں کے رفیق' دشمنوں کے دوست' سب کے لیے دعاگو' جب بھی دیکھنے کا موقع ملا عبادت گزاری میں دیکھا۔ دن کو بھی اور رات کو بھی۔ مزاجاً "فقیر لیکن امیروں کے پیشوا جو لفظ دل کی زبان سے نکلا مشرف بہ قبولیت ہوا۔ علم اتنا کہ بہت سے عالموں کے پاس مل کر نہ ہو گا۔ لکھائی ایسی کہ جیسے صفحۂ قرطاس پر موتی ٹانک دیئے ہوں۔ اردو اور انگریزی پر یکساں قدرت۔ فارسی و عربی پر پوری دسترس۔ خطوں کے جواب اس تیزی سے دیتے ہیں جیسے ہم آپ سلام کے جواب دیتے ہیں۔ رسول صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے عاشق سنت کے پیروکار' شریعت و طریقت کے پابند' سلسلہ نقشبند۔ یہ ہیں میرے استاد۔ پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب۔ ہادی بھی' رہنما بھی' اللہ تعالیٰ ایسے استاد سب کو دے۔ غالب نے کہا تھا اور وہی میں استاد کے لیے کہتا ہوں۔

~ تم سلامت رہو ہزار برس   ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

ڈاکٹر صاحب کی اب تک ساٹھ کے قریب کتابیں شایع ہو چکی ہیں۔ ان میں علمی و ادبی اور تحقیقی کتابیں بھی ہیں جیسے "سید حسن غزنوی" جو عہد غزنوی پر پہلی بنیادی تحقیق کا درجہ رکھتی ہے۔ "حالی کا ذہنی ارتقا" جس نے تحقیق میں نئے باب کا اضافہ کیا۔ ان کے علاوہ فارسی پر اردو کا اثر' علمی نقوش' فارسی کے قدیم شعراء' تحقیقی جائزے' ادبی جائزے' تحریر و تقریر' متین برہان پوری کے مرثیے' "ثقافتی اردو" تو ایک ایسی کتاب ہے کہ یہ موضوع اس انداز سے پہلی بار سامنے آیا ہے۔ "اردو میں قرآن و حدیث کے محاورات" تحقیق کا ایک نیا باب کھولتی ہے۔ سندھی اردو لغت اور اردو سندھی لغت وہ لغات ہیں جو آج سے تیس سال

پہلے تالیف کی گئی تھیں اور آج تک ان پر اضافہ نہ ہو سکا۔ جامع القواعد (حصہ نحو) وہ تصنیف ہے جو آج بھی استناد کا درجہ رکھتی ہے اقبال ان کا محبوب موضوع ہے۔ اور محبوب اس لیے ہے کہ اقبال کی شاعری میں انہیں روح اسلام کارفرما نظر آتی ہے۔ "اقبال اور قرآن" اور "معارف اقبال" جیسی کتابوں کے علاوہ متعدد مضامین انہوں نے اقبال کی شاعری کے تعلق سے لکھ کر روح اقبال اور روح اسلام کو اجاگر کیا ہے۔ دیوان روشن اور دیوان عظیم تتوی تدوین متن کی ممتاز مثالیں ہیں۔ ادب و تحقیق کی طرح تصوف انکا خاص موضوع ہے اور اس موضوع پر ان کی کم و بیش سینتیس "۳۷" تالیفات شایع ہو چکی ہیں۔ جن میں رسائل، مشاہیر نقش بندیہ، ملفوظات صوفیہ، ارشاد رحیمیہ، ہدایت الطالبین، تحفۂ زواریہ، وسلیۃ القبول، اثبات النبوۃ، رسالہ تہلیلیہ، مکاشفات عینیہ، تاریخ اسلاف، سوانح امیر کلال، سعید البیان، گلشن وحدت، مکتوبات سیفیہ، مجمع البحرین، رسالہ سلوک، لوائح خانقاہ مظہریہ، سراج منیر اور تین تین ضخیم جلدوں میں مکتوبات امام ربانی اور مکتوبات معصومیہ شامل ہیں۔ ان کے علاوہ بعض کتابوں مثلاً حضرات القدس، خزینۃ المعارف اور زُبدۃ المقامات کے اردو تراجم بھی کیے ہیں۔ انگریزی میں ان کی دو کتابیں "تاریخ بہرام شاہ غزنوی" اور "برصغیر میں فارسی ادب" قابل ذکر ہیں۔ فن لغت پر ایسا عبور کہ ماہرین فن ان کی رائے کے محتاج ہیں۔ سرتاپا انکسار اور سرتاپا علم، یہی ہماری عظیم روایت تھی اور آج اسی روایت کے وہ ملک بھر میں واحد اور ممتاز نمائندے ہیں۔ ان کی علمی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ وہ محقق بھی ہیں اور مفکر و نقاد بھی۔ مترجم بھی ہیں اور لغت نویس بھی۔ قواعد داں بھی اور عالم تصوف بھی اور یہ سب پہلو ان کی علمی اور روحانی شخصیت کے ساتھ ایک جان ہو کر ایک مکمل اکائی بن گئے ہیں۔ اسی لیے دین اسلام اور اس کی روایت ان کی ہر تحریر میں رنگ و خوشبو پیدا کرتی ہے۔ یہی ان کی تصنیف و تالیف کا مقصد ہے ایک جگہ نئی نسل سے مخاطب ہو کر لکھتے ہیں۔

> "......... دین کی تکمیل علم، عمل اور اخلاص سے ہوا کرتی ہے .... دنیوی معاملات کے لیے بھی یہی تین چیزیں ضروری ہیں۔ وہ علم بے کار ہے جس پر عمل نہ

ہو اور وہ محض فریب ہے جس میں اخلاص نہ ہو۔ ذرا دیکھیے جو عمل (ادب) ہم پیش کر رہے ہیں اس میں اخلاص کسی درجے پر موجود ہے بھی یا نہیں۔ اشتراکیت اور جنسیات اپنی جگہ مردود نہیں اور ان کا موضوع سخن بنانا کوئی عیب نہیں۔ لیکن بقول میر ؎ عیب بھی کرنے کو ہنر چاہیے ...... یاد رکھیے۔ پاکستان صرف ریت کے ٹیلوں کا نام نہیں۔ وہ جس مقصد کے لیے بنایا گیا ہے اس کے حصول کی کوشش کیجئے۔ ورنہ آپ کو نہ صرف قوم کے سامنے بلکہ خدا کے سامنے جواب دینا ہوگا۔" (تحقیقی جائزہ ص ۱۲۳ - ۱۲۲)

یہی ان کا نقطہ نظر ہے اور اسی نقطہ نظر کو انہوں نے اردو ادب کے حوالے سے اپنے ایک مضمون "تہذیب جدید کا فکری بحران" میں واضح کیا ہے۔ ان کے انداز نظر کی سب سے اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انتہا پسندی سے پاک ہے اور اعتدال کے اس راستے کی طرف لے جاتا ہے جہاں سچائی اور حق کی چاندنی پھیلی ہوئی ہے۔ زبان اور اہل زبان کی بحث یوں بھی صدیوں سے ہو رہی ہے لیکن گزشتہ چالیس سال سے پاکستان میں کسی نہ کسی عنوان سے جاری ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے اس موضوع کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لے کر بڑی پتے کی بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"کسی غیر زبان کے سیکھنے کے لیے ہم لاکھ جتن کریں ہمیں اہل زبان ہونے کا درجہ حاصل نہیں ہو سکتا۔ مثال کے طور پر انگریزی کا کوئی کتنا ہی بڑا عالم فاضل کیوں نہ بن جائے اس کو اہل زبان تسلیم نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اردو کی نوعیت مختلف ہے۔ انگریزی اجنبی اور پردیسی زبان ہے اردو اسی ملک کی زبان ہے جس کا دوسری ملکی زبانوں کے ساتھ خون کا رشتہ ناتا ہے اور لسانی اشتراک کی وجہ

ہے وہ برصغیر کے ہر حصے میں خود بخود اور اچھی طرح جانی پہچانی جاتی ہے۔ بول چال کی حد تک اس کی حیثیت بین الملکی زبان کی سی ہے اور سرکاری طور پر اسے قومی زبان کا منصب حاصل ہے۔ اس لیے پاکستان کے ہر شہری کو اردو کے اہل زبان بننے کا آئینی حق حاصل ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے جو فطری تقاضے ہیں ان سے روگردانی نہ کی جائے۔ صحت کے ساتھ جو شخص بھی اردو لکھے، پڑھے اور بولے وہ اہل زبان ہے۔ اس میں پنجاب، سندھ یا کراچی کی کوئی قید نہیں ہونی چاہیے۔ جس طرح دلی اور لکھنؤ کا فرق وقت کے ساتھ خود مٹ گیا اس طرح یہ امتیاز بھی ہمیں ختم کرنا ہوگا .... میرے نزدیک ہر وہ شخص اہل زبان ہے جو صحت زبان کی قید کے ساتھ اردو لکھنے اور بولنے پر قادر ہو۔ خواہ وہ کہیں کا رہنے والا ہو۔" (تحقیقی جائزے ص ۸۲ - ۸۵)

یہی وہ رویہ ہے جس کی ہمیں، ہمارے ملک اور قوم کی زندگی کی ہر سطح پر اپنانے کی ضرورت ہے۔ اس سے مثبت اور تعمیری فکر کے سوتے پھوٹتے ہیں اور یک جہتی و اتحاد کی فضا پیدا ہوتی ہے اور معاشرہ منفی و انتہا پسندانہ رویوں سے گریز کر کے تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کرنے لگتا ہے۔ استاد محترم ڈاکٹر صاحب نے ساری زندگی کو ایک اکائی کے طور پر اسی نظر سے دیکھا ہے اور یہی وہ طرز فکر ہے جس سے علمائے دین صاحبان ادب اور اہل نظر کو ساری زندگی اور اس کے مسائل کو دیکھنا چاہیے۔ یہ وصل کا راستہ ہے اور باقی سارے استے فصل کے راستے ہیں۔ مولانا روم نے کہا تھا۔

تو برائے وصل کردن آمدی — نے برائے فصل کردن آمدی

لسانی، نسلی و صوبائی تعصبات کے اس دور میں اسی طرز فکر کے باعث ڈاکٹر غلام مصطفیٰ

خاں صاحب ایک ایسی مشعل پر نور کی حیثیت رکھتے ہیں جس سے پاکستانی معاشرے کی ظلمتیں دور ہو سکتی ہیں۔ وہ از سر تاپا محبت ہی محبت ہیں۔ وہ محبت جس سے گلشن دل میں بہار آجاتی ہے اور زندگی نفرتوں کی دلدل سے نکل کر انسانیت کے باغ میں آجاتی ہے۔ جہاں ہر طرف مشام جاں کو معطر کرنے والے پھول ہی پھول کھلے ہیں۔ اسی شگفتگی اور اسی خوشبو سے ڈاکٹر صاحب دینی و دنیوی زندگی کو حیات نو بخش رہے ہیں۔ خدا انہیں ہمارے سروں پر تادیر قائم رکھے۔ آمین ثم آمین

مہمان خصوصی مرشدنا و مولانا حضرت ڈاکٹر صاحب دامت برکاتہ مجلس کے آخر میں اختتامی کلمات طیبات کا اظہار فرماتے ہیں

حضرت مولانا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ عالی

محترم بزرگو اور عزیزو!

میں آپ سب حضرات کا بہت ممنون ہوں کہ آج آپ نے مجھے اپنی ہم نشینی کا شرف بخشا اور فاضل مقررین نے اپنے کلمات تحسین سے نوازا۔ لیکن ان کلمات کی حقیقت کچھ اس طرح ہے کہ یہ مقررین وہی حضرات ہیں جو میرے خاص کرم فرما ہیں۔ اس لیے اگر انہوں نے جوش محبت میں میرے متعلق کچھ مبالغے سے کام لیا ہے تو آپ حضرات اس سے متاثر نہ ہوں بلکہ دعا فرمائیں کہ ان کے خیال کے مطابق مجھے کسی لائق بننے کی سعادت حاصل ہو جائے۔

میرے بزرگو اور عزیزو! آج مجھے نواب صدیق حسن خان مرحوم کی کتاب ابقاء المنن یاد آرہی ہے۔ اس کتاب میں انہوں نے اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کا تفصیل سے ذکر کیا ہے جو انہیں عطا ہوئی تھیں۔ میں بھی تحدیث نعمت کے طور پر اپنے چند بزرگوں کی بعض باتیں اجمالاً عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں بھی ان باتوں کو اپنے لیے نعمت سمجھتا ہوں۔ شاید ہمارے نوعمر سامعین ان باتوں سے کوئی فائدہ حاصل کر سکیں۔ میں چھوٹا تھا کہ والد صاحب کا انتقال

ہو گیا اس لیے والدہ مرحومہ اور بڑے بھائی مرحوم کے زیر تربیت رہا۔ وہ مجھے رات کو تین بجے اٹھا دیتے تھے اور فرماتے تھے کہ دین اور دنیا کے کاموں کے لیے صحیح وقت تہجد سے فجر تک ہوتا ہے۔ پھر یہ نصیحت بھی تھی کہ تمام مسلمانوں کی بھلائی کے لیے دعا کیا کرو اور کسی کے انتقال کی خبر ملے تو اس کے لیے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب بھی کیا کرو۔

مجھے بچپن ہی میں علی گڑھ بھیج دیا گیا تھا۔ وہاں بکثرت اساتذہ کی شفقتیں حاصل رہیں۔ لیکن چند بزرگ ایسے تھے جن سے خصوصی تعلق رہا۔ یعنی مولانا سلیمان اشرف رحمتہ اللہ علیہ، مولانا ابوبکر محمد شیث جونپوری رحمتہ اللہ علیہ، قاری ضیاء الدین احمد الہ آبادی رحمتہ اللہ علیہ، پروفیسر ضیاء احمد بدایونی رحمتہ اللہ علیہ اور مولانا احسن مارہروی رحمتہ اللہ علیہ۔ مولانا سلیمان اشرف رحمتہ اللہ عصر کے بعد تفسیر پڑھاتے تھے اور مغرب کے بعد بخاری شریف۔ وہ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی رحمتہ اللہ علیہ کے مرید اور خلیفہ بھی تھے۔ لیکن ہمیشہ مولانا ابوبکر رحمتہ اللہ کے پیچھے نماز پڑھا کرتے تھے۔ جو دیوبندی تھے۔ ان کی تاکید تھی کہ "قرآن بہت پڑھا کرو تاکہ تمہاری عربی کی قابلیت اچھی ہو جائے۔" مولانا ابوبکر محمد شیث رحمتہ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ عربی خوب پڑھو، کیونکہ عربی میں دوسری زبانوں کے مقابلے میں زیادہ علوم و فنون ہیں۔" قاری ضیاء الدین احمد رحمتہ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ "اللہ تعالیٰ سے ہمیشہ اچھی امید رکھو اور مایوسی کو قریب نہ آنے دو۔" پروفیسر ضیاء احمد رحمتہ اللہ کی خدمت میں یہ سبق ملتا تھا کہ "طبیعت کیسی ہی خراب ہو اپنا مطالعہ کبھی ترک مت کرو۔" اور حضرت سعدی رحمتہ اللہ علیہ کے لیے ان کے پیر حضرت شہاب الدین سہروردی رحمتہ اللہ علیہ کی جو نصیحت تھی وہ بھی یاد دلاتے تھے کہ۔

مرا پیر دانائے روشن شہابؒ دو انداز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ در نفس خودبین مباش دگر آنکہ در جمع بدبین مباش

مولانا احسن مارہروی رحمتہ اللہ علیہ کی نصیحت تھی کہ "رمضان المبارک میں شعر و شاعری سے بالکل تعلق نہ رکھو۔"

علی گڑھ ہی میں نواب حبیب الرحمٰن شروانی رحمتہ اللہ علیہ کی بھی شفقتیں حاصل ہوئیں۔ کئی مرتبہ حبیب گنج کے مخطوطات سے استفادہ کرنے کا موقع ملا۔ وہ فرماتے تھے کہ

"صرف مشکل کام کا انتخاب کرو' آسان کام مرد کو زیب نہیں دیتا۔"

علی گڑھ میں مولانا سید سلیمان ندوی رحمتہ اللہ علیہ کی بھی تشریف آوری ہوا کرتی تھی۔ اسی زمانے سے ان سے استفادہ کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ وہاں موسم گرما میں بعض حضرات (بالخصوص استاذی پروفیسر رشید احمد صدیقی رحمتہ اللہ علیہ) شیروانی کے ساتھ ہیٹ پہنا کرتے تھے۔ مولانا سے دریافت کیا کہ ہیٹ لگانا کیسا ہے؟ فرمایا کہ "سر پر لگانے میں تو حرج نہیں' دل پر نہ لگایا جائے۔" یہ تمام باتیں چھوٹی ہیں لیکن میرے لیے بہت بڑی ثابت ہوئیں اور مشعل راہ بھی بنیں۔ میں ان باتوں کو انعامات الٰہیہ ہی سمجھتا ہوں۔

استاذی پروفیسر ضیاء احمد بدایونی کی سخت کوشی کا ذکر اوپر آیا ہے۔ وہ بیک وقت عربی' فارسی' اردو تینوں زبانوں کے ادب میں تبحر رکھتے تھے۔ بلکہ عربی کے بعض قصائد جو مخطوطات میں میرے زیر مطالعہ تھے۔ ان کی تصحیح کے لیے میں انہی کو زحمت دیا کرتا تھا۔ جب کہ دوسرے فضلا اس کام کو ٹال جاتے تھے۔ استاذی موصوف رحمتہ اللہ علیہ ہی نے مجھے سید حسن غزنوی پر کام کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ یہ سنائی غزنوی کے ہم عصر تھے۔ ان کا ایک عربی شعر بہت مشہور ہے۔

سلموا یا قوم بل صلوا علی الصدر الامین　　مصطفٰی ماجاء الا رحمتہ للعالمین

سید حسن غزنوی پر کام کرنا بہت دشوار تھا اور فارسی کے ایک مشہور محقق نے مجھے اس سے باز رکھنا چاہا۔ لیکن نواب حبیب الرحمٰن شروانی رحمتہ اللہ علیہ نے مجھے ڈانٹ کر لکھا کہ "تم یہی کام کرو اور مرد بنو جیسے کہ ہو۔" چنانچہ پھر میں نے یہی کام شروع کیا۔ اور اس سلسلے میں برصغیر کے اکثر معروف اور غیر معروف کتب خانے دیکھے۔ برٹش میوزیم' انڈیا آفس اور پیرس کے بعض مخطوطات کے عکس بھی حاصل کیے۔ پھر اللہ تعالیٰ کا ایسا کرم ہوا کہ مخطوطات کی مدد سے میں نے انگریزی میں تاریخ بہرام شاہ غزنوی لکھی اور چھٹی صدی ہجری کے حسب ذیل شعرا پر تحقیقی مقالے لکھے۔

برہانی' معزی' سید حسن غزنوی' حکیم سنائی' ادیب صابر' عبدالواسع جبلی' حکیم سوزنی' ازرقی' عمادی غزنوی' عثمان مختاری' نجیب الدین جر بادقانی' مجیر بیلقانی' رضی الدین نیشاپوری' پھر معلوم تبریزی' حسن مروزی' جلال ہروی' بیدل اور بعد میں حضرت مظہر اور

صائب کے شاگرد ظہیر وغیرہ پر بھی لکھنے کا موقع ملا۔ ان میں سے اکثر مقالات انسائکلو پیڈیا آف اسلام (اردو) میں شامل ہو گئے ہیں۔ ان کے علاوہ متعدد مقالات ملک کے اردو اور انگریزی رسالوں میں شایع ہوئے ہیں۔

علی گڑھ سے ۱۹۳۶ء میں فارغ ہوا۔ چند ماہ بیکار رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ کے خصوصی فضل و کرم سے پبلک سروس کمیشن (ناگ پور) نے مجھے کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی (برار) میں مقرر کیا۔ تین سال کے بعد ناگ پور یونی ورسٹی نے مجھے صدر شعبہ اردو منتخب کیا اور یہ منصب ۱۹۴۸ء تک قائم رہا۔ اس دوران ایسے انعامات الٰہیہ بھی حاصل ہوئے کہ جن کا شکر کسی طرح بھی ادا نہیں ہو سکتا۔ یہ سب داستان تقسیم ہند سے پہلے کی ہے۔ اس کے بعد جو حالات اور واقعات رونما ہوئے ان میں سے اکثر و بیشتر میرے کرم فرما حضرات کو معلوم ہیں اس لیے ان کے بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ اب تو وہ وقت پیش نظر ہے جس سے کسی کو مفر نہیں۔ کسی کا مشہور شعر ہے کہ

؎ بیرون گور لاف کرامت چہ می زنی ایماں اگر بگور بری صد کرامت است

آخر میں آپ سب حضرات کا پھر شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے مجھ گوشہ نشین اور ہیچ میرز ہیچ مداں کو ایسی عزت بخشی۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

(صدراتی خطاب)

نورالحسن جعفری صاحب

محترم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب حضرات و خواتین

میں نے ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب) سے درخواست کی تھی کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب سے قبل مجھے ---- کچھ کہنے کی اجازت دی جائے۔ لیکن انہوں نے مجھے اجازت نہیں دی۔ یہ میری بے عزتی ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب (حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ) کے بعد آپ سے مخاطب ہوں پہلے تو میں انجمن کی طرف سے ڈاکٹر صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ہمیں یہ اعزاز بخشا۔

جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے مجھ پر اللہ تعالیٰ کے بڑے احسانات ہیں اور آج کی

صدارت میں سمجھتا ہوں کہ میرے لیے (آواز بھرا گئی اور الفاظ سمجھ میں نہیں آئے)

ڈاکٹر صاحب کے اسم گرامی سے تو میں واقف تھا لیکن میں گذشتہ سال عمرہ پر گیا تو ایک صاحب نے مجھے مسجد نبوی میں ----- (گریہ طاری ہو گیا۔ اور بات سمجھ میں نہ آسکی) میں نے ڈاکٹر فرخی (ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب) سے تذکرہ کیا تو انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ ڈاکٹر صاحب مدظلہٗ سے میری ملاقات کروائیں گے۔ لیکن انہوں نے ---- آج مجھے اپنی محرومی کا احساس کچھ زیادہ ہوا۔ لیکن بہرحال اللہ تعالیٰ کا احسان ہے کہ مجھے اس جلسہ کی صدارت کا اعزاز بخشا۔ میں صرف دعا کر سکتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ڈاکٹر صاحب (ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ) کو تادیر ہمارے سروں پر قائم رکھے اور مجھے بھی موقع ملے[1] ----- (رونے کی وجہ سے مزید تقریر نہ کرسکے) ۔ بہت بہت شکریہ

---

[1] جعفری صاحب پر دوران تقریر اس قدر گریہ طاری تھا کہ صحیح طرح تقریر نہیں کرسکے۔ آخر میں روتے ہوئے اٹھے اور حضرت صاحب مدظلہ عالی سے گلے لگ کر خوب روتے رہے۔ تمام سامعین و ناظرین پر بھی رقت آمیز کیفیت دیکھنے میں آئی۔ جعفری صاحب نے حضرت صاحب مدظلہٗ عالی سے عرض کیا کہ میں آپ کے فیض سے محروم رہا اور آپ کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ حضرت صاحب مدظلہٗ نے ان کے ساتھ بڑی شفقت و محبت فرمائی۔

”شام ہمدرد“

منجانب : ہمدرد فاؤنڈیشن

مقام : AVARI TOWER کراچی

میزبان : حکیم محمد سعید صاحب

۱۹۹۲ء

مہمان خصوصی :

صاحب علم و حکمت حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مد ظلہ عالی

صدر محفل : احسان رشید صاحب (وائس چانسلر جامعہ کراچی)

شرکاء

(۱) میجر آفتاب حسن صاحب

(۲) شان الحق حقی صاحب

(۳) محترمہ زینت رشید صاحب

(۴) پروفیسر حسنین کاظمی صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ہمدرد فاؤنڈیشن (پاکستان) کی جانب سے وحید العصر حضرت مولانا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ عالی کی شان میں ایک اعزازی تقریب بتاریخ ۱۴ مئی ۱۹۹۲ء، بمقام آواری ٹاور ہوٹل، کراچی میں منعقد ہوئی۔

شام ہمدرد

- شام ہمدرد کی ابتدا تلاوت قرآن پاک سے ہوئی۔
- محترم حکیم محمد سعید صاحب نے
- مہمان خصوصی : صاحب علم و حکمت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب
- صدر محفل : جناب احسان رشید صاحب (سابق وائس چانسلر کراچی یونی ورسٹی)
- میجر آفتاب حسن صاحب
- جناب شان الحق حقی صاحب
- محترمہ زینت رشید صاحبہ
- جناب پروفیسر حسنین کاظمی (پرنسپل نیشنل کالج کراچی)

کا استقبال کیا اور حسنین کاظمی صاحب کو مہمانوں کا تعارف پیش کرنے کی دعوت دی۔

پروفیسر حسنین کاظمی صاحب نے فرمایا!

محترم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کا نام اہل علم و فضل کے لیے ہی نہیں اہل حال و اہل دل کے لیے بھی معتبر و محترم ہے۔ پاکستان میں ہم نے لفظوں کو اس قدر بے احتیاطی سے استعمال کیا ہے کہ وہ توقیر و معنوں سے محروم ہوگئے ہیں۔ اس کے باوجود حقیقت اور سچائی کے اظہار کے لیے اب بھی الفاظ ہی وسیلہ بنتے ہیں۔ مثلاً ہم کہتے ہیں "جامع الصفات" اب ان لفظوں کی حقیقت، حقیقی معنی اگر سمجھنا ہیں تو ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی ذات کے حوالہ

سے سمجھ میں آجائے گی۔ ایک گھنا اور سایہ دار درخت ہوتا ہے۔ وہ کڑی دھوپ کی ساری تمازت اپنے اندر جذب کر کے اپنے سایے میں بیٹھنے والوں کو ٹھنڈک اور عافیت مہیا کرتا ہے۔ ہماری سماجی زندگی کی دھوپ میں جب بھی تمازت زیادہ ہو جاتی ہے تو عافیت تلاش کرنے والے ڈاکٹر صاحب جیسی شخصیتوں کا سایہ ڈھونڈتے ہیں اور وہاں ان کو عافیت کا یہ سایہ واقعی میسر آجاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب جیسے لوگوں کے لیے تدریس کا شعبہ ہی موزوں ترین ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کنگ ایڈورڈ کالج (امراوتی۔ ناگ پور) سے تدریس کا آغاز کیا۔ پھر ناگ پور یونی ورسٹی سے وابستہ ہوئے۔ ڈاکٹر صاحب نے ناگ پور یونی ورسٹی سے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کی۔ اسی یونی ورسٹی نے آپ کو ڈی لٹ کی سند سے بھی نوازا۔ پاکستان میں ڈاکٹر صاحب اول اسلامیہ کالج بعدہ وفاقی اردو کالج میں صدر شعبہ اردو رہے اور پھر سندھ یونی ورسٹی کے شعبہ اردو سے ایسی وابستگی قائم کی کہ کسی نہ کسی صورت میں آج بھی موجود ہے۔ سندھ یونی ورسٹی سے ڈاکٹر صاحب کی وابستگی باہمی تنازعات کی کڑی دھوپ میں جیسا کہ پہلے عرض کیا ہے وہ ایک سایہ دار درخت کی سی رہی ہے۔ جس کے سائے میں انسانیت نوازی کی ٹھنڈک اور جس سے ہمیں محبت اور سچائی کی قوتوں کی توانائیوں کا اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب اردو، عربی، فارسی اور انگریزی پر پورا عبور رکھتے ہیں۔ تصانیف کی تعداد ستر سے تجاوز کر چکی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی تصانیف و تالیفات میں چند قابل ذکر کتابیں یہ ہیں۔

- حالی کا ذہنی ارتقاء
- فارسی کا اردو پر اثر
- علمی نقوش
- فارسی کے قدیم شعراء
- تاریخ بہرام شاہ غزنوی
- رسائل مشاہیر نقشبندیہ
- ملفوظات صوفیہ
- ارشاد رحیمیہ
- ہدایت الطالبین

اس کے علاوہ اقبالیات اور اردو سندھی لغت۔ برصغیر پاک و ہند میں فارسی ادب' اور قرآن و حدیث جیسی تصانیف بھی ڈاکٹر صاحب کی تخلیقات کے ذخیرے میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں بہت سے اہل علم نے اپنے تحقیقی مقالے کامیابی سے مکمل کئے اور ان میں ایک اہم نام ملک کے معروف صاحب علم و دانش ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب ہیں۔ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کو اکیڈمی آف لیٹرز نے اعزاز سے نوازا اور حکومت پاکستان کی جانب سے صدارتی ایوارڈ' گولڈ میڈل اور ستارہ امتیاز عطا ہوا۔ اور آخر میں سب سے اہم بات یہ کہ ڈاکٹر صاحب نے سندھ یونی ورسٹی اولڈ کیمپس میں قرآن فہمی کے درس کا سلسلہ شروع کیا ہوا ہے اور سندھ اور بیرون سندھ کے بے شمار لوگ اس درس سے مستفید ہو رہے ہیں اور جہاں ڈاکٹر صاحب نے درس کی ابتدا کی تھی وہاں اب ایک مسجد تعمیر کرلی گئی ہے۔ قرآن فہمی کا وسیلہ بننے کے لیے علم کی وسعتوں کے ساتھ کردار کی تاثیر بھی جزو لازم ہے۔ کیونکہ یہ کتاب لفظوں سے زیادہ اعلیٰ کردار کے ذریعہ سمجھ میں آتی ہے اور اس اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کے درس میں شریک ہونے والے خوش قسمت ہیں کہ ان کو یہ دونوں صفات بہ یک وقت میسر ہیں۔

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب

الحمدللہ وکفیٰ وسلام .... امابعد

فخر قوم، حکیم محمد سعید صاحب' میرے محترم ----------------

اور معزز حاضرین! میں آپ حضرات کا بے حد ممنون ہوں کہ آپ نے مجھ جیسے عاجز شخص کو طلب فرما کر عزت افزائی فرمائی اور کچھ عرض کرنے کی سعادت بخشی۔ میں اپنی زندگی کے بعض تجربات عرض کرنا چاہتا ہوں ممکن ہے کسی کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔

میں ۱۳۲۱ھ ، ۱۹۱۲ء میں جبل پور (سی پی) میں پیدا ہوا۔ بچپن میں والد صاحب اللہ کو پیارے ہو گئے۔ چنانچہ والدہ مرحومہ اور بڑے بھائی صاحب مرحوم کے زیر تربیت رہا۔ قریب ۴ سال کا تھا تو اکثر بیمار رہتا تھا۔ والدہ نے فرمایا کہ تم قرآن پاک کی تلاوت پابندی کے ساتھ کیا کرو انشاء اللہ اس کی برکت سے بیماری بھی دور ہو جائے گی اور دوسری پریشانیاں بھی ختم

ہو جائیں گی۔ یہ ہمارا ایمان ہے۔ اب ایمان بدل جائے ہمارا تو اور بات ہے۔

میری والدہ نے میری تربیت کے لیے ایک عجیب اور مفید طریقہ یہ اختیار کیا تھا کہ وہ مجھے سنا سنا کر دوسری خواتین سے فرماتی تھیں کہ ''میرے بچے کو پڑھنے کا اتنا شوق ہے کہ کھانے تک کی پرواہ نہیں کرتا۔ میری اجازت کے بغیر کہیں نہیں جاتا اور نماز کے لیے مسجد ہی کو ترجیح دیتا ہے۔'' ذرا غور فرمائیں کہ ایسے جملے ایک کم عمر بچے کی تربیت کے لیے کس قدر مفید ہو سکتے ہیں۔ روزہ رکھنے کے لیے بھی عجیب ترکیب تھی۔ میرے بچپن میں رمضان المبارک کا مہینہ سخت گرمی میں واقع ہوتا تھا۔ والدہ فرماتی تھیں کہ سحری آتی ہے۔ عمدہ عمدہ کھانے لاتی ہے۔ جو بچے جاگ جاتے ہیں انہیں وہ کھانے بھجواتی ہے اور جو بچے سوتے رہتے ہیں انہیں نہیں ملتا۔ میں سمجھتا تھا کہ سحری کوئی عورت ہے جو گھر گھر اچھے کھانے تقسیم کرتی ہے۔ میں والدہ سے عرض کرتا کہ مجھے ضرور جگا دیا کریں۔ چنانچہ جب وہ کھانے تیار کر لیتیں تو وہ مجھے جگا دیتیں کہ دیکھو یہ کھانے سحری دے گئی ہے۔

والدہ کی دو نصیحتیں تھیں کہ حتی الامکان اپنے شہر کے ہر مسلمان کی تجہیز و تکفین میں ضرور شریک ہوا کرو اور جب کسی مسلمان کے انتقال کی خبر سنو یا اخبار میں پڑھو تو اس کے لیے دعائے مغفرت اور ایصال ثواب کیا کرو۔ اسی طرح میرے بڑے بھائی صاحب مرحوم کا مجھ پر ایک بہت بڑا احسان ہے کہ وہ مجھے تین بجے رات کو جگا دیا کرتے تھے اور فرماتے تھے کہ بس اس وقت دین کا کچھ کام کر کے اپنی پڑھائی میں لگ جاؤ۔ پھر چاہے دن بھر کھیلو۔ مرحوم نے میرا یہ معمول بنا دیا تھا کہ بچپن میں تو ناگوار تھا لیکن میری زندگی کی کامیابی کے لیے یہی سرمایہ خیر ثابت ہوا۔

اب اس علم و حکمت والے اجلاس میں ایک خاص بات بھی عرض کرنا چاہتا ہوں کہ میں جب دس سال کا تھا تو میرے نانا صاحب خواب میں تشریف لائے (حالانکہ وہ میری پیدائش سے ۱۲ سال پہلے فوت ہو چکے تھے۔) انہوں نے فرمایا کہ تم نہار منہ زعفران کی ۴۔۵ پتیاں تھوڑی سی شکر کے ساتھ کھا لیا کرو۔ مجھے یہ تو نہیں بتایا کہ کس مقصد کے لیے۔ لیکن اس کے استعمال سے میرا حافظہ اس قدر تیز ہو گیا کہ پورے شہر میں کوئی طالب علم میرے مقابلے کا نہیں تھا۔ پرائمری اسکول کے تمام امتحانوں میں' میں اول آیا۔ اول آنے سے چار سال تک

مجھے چار روپے ماہانہ وظیفہ ملتا رہا۔ جو آج سے بہتر۷۲ سال پہلے یہ کچھ کم رقم نہیں تھی۔ پھر علی گڑھ میں بھی مجھے نمایاں کامیابی حاصل ہوتی رہی۔

اب میں علی گڑھ کے بعض محسن اساتذہ کا ذکر کروں گا۔ میرے محترم پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب مرحوم' ان کی تحریریں علی گڑھ کی زندگی کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ زندہ دلی اور حاضر جوابی میں اپنی مثال آپ تھے۔ مجھے اندازہ ہے کہ بعض ناگوار حالات میں بھی وہ نہایت سنجیدہ رویہ اختیار کرتے تھے کہ پیشانی پر بل بھی نہیں آتا تھا۔ پڑھانے میں ان کی بذلہ سنجی مشہور تھی۔ غالب' حالی اور اصغر کا کلام ایسے مزے لے لے کر پڑھاتے تھے کہ پڑھنے والے کے دل میں شعراء کی عظمت جاگزین ہو جاتی تھی۔ مولانا روم نے صحیح فرمایا ہے۔؎

پس قیامت شو قیامت راگزیں
دیدم ہر چیز را سرگستہ ایں

دوسرے خاص استاد مولانا احسن مارہروی تھے۔ وہ حضرت داغ کے عزیز شاگرد اور اردو زبان و ادب کے مستند استاد۔ ان کی گفتگو میں گویا پھول جھڑتے تھے اور زبان ایسی لکھتے تھے کہ اس کا لطف فراموش نہیں ہو سکتا۔ ہمارے فائدے کے لیے انہوں نے ایک مرتبہ فرمایا تھا کہ؎

مطمئن اپنے یقیں پر اگر انساں ہوجائے
سو حجابوں میں جو پنہاں ہے نمایاں ہوجائے

ایک فاضل استاد پروفیسر ضیاء احمد بدایونی تھے جو گو کہ فارسی کے استاد تھے لیکن بہ یک وقت عربی' فارسی اور اردو ادب کے باکمال محقق تھے۔ عربی مخطوطات اس خوبی کے ساتھ قرات کرتے تھے کہ خود عربی کے بعض مشہور اساتذہ حیرت کرتے تھے۔ ان کے مقالات کے دو مجموعے اپنی تحقیق اور تنقید کے لحاظ سے بہت اہم ہیں اور مومن کے متعلق جو کام انہوں نے کیا آج تک اس پر کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ ان کی نصیحت حضرت سعدی کی زبان میں اس طرح تھی

مرا پیر دانائے روشن شہاب دو انداز فرمود بر روئے آب
یکے آنکہ در نفس خودبیں مباش دگر آنکہ در جمع بد بیں مباش

(مفہوم : میرے پیر دانا حضرت شیخ شہاب الدین سہروردیؒ نے دریا کے کنارے مجھے دو نصیحتیں فرمائیں۔ ایک یہ کہ اپنی برائیوں پر نظر رکھو اور دوسروں کی اچھائیوں کو تلاش کرو کوئی برا نظر ہی نہیں آئے گا۔)

میرے ایک بزرگ استاد مولانا سلیمان اشرف علیہ الرحمہ بھی تھے۔ نہایت خوبصورت' خوش پوش تھے۔ عصر کے بعد تفسیر اور مغرب کے بعد بعض دنوں میں بخاری شریف پڑھاتے تھے اور مولانا احمد رضا خاں صاحب علیہ الرحمہ کے خاص خلفاء میں سے تھے۔ ان کے مسلک میں تشدد نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ مولانا ابوبکر محمد شیثؒ جونپوری کے پیچھے نماز پڑھتے تھے جو دیوبندی مسلک کے تھے۔ جماعت میں تکبیر شروع ہوتے ہی کھڑے ہو جاتے اور اگر کبھی وہ خود نماز پڑھاتے تو دعا میں آج کل کی طرح آیت ان اللہ وملئکتہ .... نہیں پڑھتے تھے۔ البتہ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام پاک سنتے یا پڑھتے تو انگوٹھوں کے بجائے "سبابہ" انگوٹھے کے پاس کی انگلیوں کو لبوں سے لگا کر آنکھوں پر پھیر لیتے تھے۔ میں ان کی خدمت میں برسوں رہا لیکن کبھی ان کی زبان سے دوسرے مسلک کے خلاف کوئی لفظ نہیں سنا۔ البتہ سرسید کی تفسیر کی خوب مرمت کرتے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حاضر اور ناظر ہونے کا مسئلہ جو آج کل بہت زوروں پر ہے ان کے زمانے میں نہیں تھا۔

اب میں ایک اور فاضل بزرگ حضرت قاری ضیاء الدین الہ آبادی کا ذکر کرتا ہوں۔ برصغیر پاک و ہند میں تجوید و قرات کا کوئی استاد ان سے ناواقف نہیں۔ عربی نثر و نظم برجستہ لکھتے تھے۔ لیکن بہت کم سخن اور بہت کم آمیز تھے۔ ان کے فضل و کمال کے متعلق صرف اتنا کہنا کافی ہو گا کہ انہوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی کی دستار بندی فرمائی تھی۔ انہوں نے مجھے عربی اور تجوید پڑھائی اور روایت حفصؒ کی سند عطا فرمائی۔ پھر فرمایا کہ "میں تم کو انشاء اللہ شاطبی پڑھاؤں گا۔" میرا لڑکپن تھا۔ میں نے اس جملے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ لیکن ان کے کردار کی شان دیکھیے کہ بہت عرصے کے بعد جب وہ ستر سال کے ہو چکے تھے اور میں کنگ ایڈورڈ کالج امراوتی میں استاد تھا۔ ان کا گرامی نامہ آیا۔ تحریر فرمایا کہ "میں نے تم سے شاطبی پڑھانے کا وعدہ کیا تھا۔ زندگی کا بھروسہ نہیں۔ میں وعدہ پورا کرنے کے لیے تمہارے پاس آتا ہوں۔"

ان کی اس بزرگانہ شفقت پر حیرت ہوئی لیکن وہ تن تنہا قریب ڈیڑھ ہزار میل کا سفر اور وہ بھی ستر (۷۰) سال کی عمر میں طے کر کے تشریف لائے اور ہر فرصت میں صبح سے رات تک مجھے پڑھاتے رہے گویا "چاہ بہ تشنہ نہ تشبہ بہ چاہ" دنیا میں ایسی مثالیں شاذونادر ہی ملیں گی۔

حضرت نے مجھے ایک ہی نصیحت فرمائی تھی جو میری زندگی کی ہر مشکل میں ڈھارس بندھاتی رہی اور وہ یہ تھی کہ "ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے اچھی امید رکھنا۔" اسی امید کے ساتھ اب میں اس مختصر تقریر کو ختم کرتا ہوں۔ وآخر دعوانا ....

احسان رشید صاحب

آخر میں صدر گرامی جناب احسان رشید صاحب نے فرمایا!

حکیم محمد سعید صاحب، مہمان خصوصی پرفیسر غلام مصطفےٰ خاں صاحب، پرفیسر آفتاب حسن صاحب، جناب شان الحق حقی صاحب، محترمہ بیگم زینت رشید احمد صاحبہ و خواتین و حضرات!

اس مجلس میں جہاں حکیم صاحب سپاسنامہ اعتراف ان ذی مرتبت شخصیتوں کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں مجھے ایک اعتراف کرنا ہے۔ آج کی مجلس میں مجھے انہوں نے جس حیثیت سے رکھا ہے کہ ان شخصیتوں کے قدموں میں بیٹھنے کے قابل ہوا ہوں۔ انہوں نے مسند صدارت پر بٹھایا ہے تو جتنی دیر یہاں میں بیٹھا ہوں، میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ایمان داری سے اپنی اوقات کا احساس کرتا رہا ہوں۔ وقت کم ہے لیکن اگر میں چند جملے بھی ان عالی صفات شخصیتوں کے بارے میں کہنا چاہوں تو مشکل معلوم ہوتا ہے۔ وقت ناکافی ہے لیکن اجازت دیجیے کہ آپ کی خدمت میں ہدیہ تبرک ذاتی طور پر پیش کروں (دیگر حضرات کے تذکرے کے بعد) - - - - - -

مہمان خصوصی پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے بارے میں کیا عرض کروں کہ انہوں نے جو کچھ بھی فرمایا ہے وہ اس اعتبار سے کسی صدی یا زمان و مکان کی قیود سے بالاتر ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ (حضرت ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب مدظلہ) اسی مقصد (اصلاح) کے لیے دنیا میں بھیجے گئے ہیں۔

مہمان خصوصی

"حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ عالی
کی علمی، تحقیقی اور ادبی خدمات کے اعتراف میں اعزازی تقریب"

منجانب : پاکستان نیشنل اکیڈمی

مقام : شیرٹن ہوٹل ۔ کراچی

میزبان : ڈاکٹر خاور جمیل صاحب

۱۹۹۵ء

صدارت : جسٹس نعیم الدین صاحب (سابق چیف الیکشن کمشنر)

شرکاء

(۱) ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب

(۲) ڈاکٹر ارشاد الحق قدوسی

(۳) ڈاکٹر نجم الاسلام (صدر شعبہ اردو جامعہ سندھ)

(۴) ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہٗ ونصلی علیٰ رسولہ الکریم

سبحان اللہ و بحمدہٖ سبحان اللہ العظیم

حضرات و خواتین!

جوش ملیح آبادی نے کہا تھا۔

"بہت جی خوش ہوا اے ہمنشیں کل جوش سے مل کر
ابھی ادبی شرافت کے نمونے پائے جاتے ہیں"

ادبی شرافت کے ایسے ہی ماورائے روزگار نمونے کے اعزاز میں پاکستانی نیشنل اکیڈمی کی جانب سے یہ تقریب پذیرائی منعقد ہوئی۔ میرا مطلب ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب مدظلہ' عالی سے ہے۔ ہمارے ایک دوست کی رائے میں یہ تقریب ادبی بھی ہے اور ادب کی بھی ہے۔ اس میں جسٹس نعیم الدین صاحب بطور مہمان خصوصی شریک ہیں اور میں ان دونوں معزز ہستیوں کی اجازت سے تقریب کی کارروائی کا آغاز کرتا ہوں۔ سب سے پہلے حافظ منیر احمد صاحب سلمہٗ سے درخواست ہے کہ تلاوت کلام پاک کے لیے تشریف لائیں۔

حافظ قاری مولانا منیر احمد خاں صاحب سلمہٗ

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَيَقُولُ ------------------ اِلَيۡهِ مَتَابِ

اب میں درخواست کرتا ہوں جناب شاہد نذیر خاں صاحب سلمہٗ سے کہ وہ آئیں اور نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ و آلہ و سلم پیش کریں۔

نہ کہیں سے دور ہیں منزلیں' نہ کوئی قریب کی بات ہے
جسے چاہیں اس کو نواز دیں یہ در حبیب کی بات ہے------------

حاضرین کرام!

ڈاکٹر محمد خاور جمیل' محترم ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب جو ہمارے ملک کے نامور محقق ادبی

مورخ اور دانش ور ہیں انکے صاحب زادے ہیں۔ ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے شاگرد ہیں۔ اس لحاظ سے نہ صرف ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب خاور صاحب کے دادا استاد ہوئے۔ جمیل جالبی صاحب نے ایک مقام پر اپنے استاد کے لئے لکھا ہے کہ ان کی علمی شخصیت ہمہ جہت ہے۔ وہ محقق بھی ہیں اور مفکر اور نقاد بھی۔ مترجم بھی ہیں اور لغت نویس بھی۔ قواعد دان بھی ہیں اور عالم تصوف بھی' اور یہ سب پہلو ان کی علمی اور روحانی شخصیت کے ساتھ یک جان ہو کر ایک مکمل اکائی بن گئے ہیں۔ اب دیکھتے ہیں کہ ڈاکٹر خاور جمیل صاحب اپنے والد بزرگوار کے استاد محترم کو کن الفاظ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہیں۔ خطبہ استقبالیہ پیش کرنے کے لیے درخواست کر رہا ہوں ڈاکٹر محمد خاور جمیل سے جو ادبی تنظیم پاکستان نیشنل اکیڈمی کے اعزازی چیئرمین بھی ہیں۔

ڈاکٹر محمد خاور جمیل

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

عزت مآب جسٹس نعیم الدین صاحب' گرامی قدر اعلیٰ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب' محترم مقررین و معزز حضرات و خواتین! السلام علیکم!

میں پاکستان نیشنل اکیڈمی کراچی اور اس کے اراکین کی جانب سے آپ سب کو آج کے اس جلسے کے مہمان خصوصی ریٹائرڈ جسٹس نعیم الدین صاحب کا انتہائی ممنون و مشکور ہوں کہ آپ نے تمام مصروفیات کے باوجود ہماری درخواست کو شرف قبولیت بخشا۔ یہ آپ کی علم دوستی' ادب و ثقافت سے لگاؤ دین و مذہب' تصوف اور گہری وابستگی کا ایک منہ بولتا ثبوت ہے۔

خواتین و حضرات!

پاکستان نیشنل اکیڈمی نے علمی ادبی اور ثقافتی سرگرمیوں کے فروغ اور ترویج کے لیے پچھلی دو دہائیوں میں جو خدمات انجام دی ہیں اس کی تفصیل میں جانے کی میری ناچیز رائے میں اس وقت ضرورت نہیں۔ کیونکہ آپ تمام حضرات ان سے بخوبی واقف ہیں۔ آج کی یہ تقریب اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مگر آج کا یہ جلسہ ہمارے تمام سابقہ جلسوں سے مختلف

بھی ہے اور منفرد بھی۔ وہ یوں کہ اس کا انعقاد ایک ایسی ہستی کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے کیا گیا ہے جس کی علمی، ادبی اور فکری خدمات کے علاوہ روحانی برکات سے ایک عالم مستفیض ہو رہا ہے۔ میری مراد شیخ طریقت حضرت مولانا ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کی قابل احترام ہستی سے ہے۔ جو ہماری خوش قسمتی سے اس وقت ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ایسی ہستیوں کی موجودگی خیر و برکت کا سبب بنتی ہے۔

معزز حاضرین!

پاکستان نیشنل اکیڈمی نے اب تک جتنے جلسے منعقد کیے ہیں جن مذاکروں اور تقریبات کا اہتمام کیا ہے ان کا اولین مقصد لوگوں کو فکری آسودگی بہم پہنچانا ہے اور ان کی ذہنی تشنگی دور کرنا ہے۔ خاص طور پر آج کی تقریب، مجھے امید ہے کہ ہمارے شہر کے موجودہ حالات میں یہ ایک تازہ ہوا کا جھونکا ثابت ہوگی۔ انشاءاللہ!

میں تمام مقررین کا بے حد ممنون ہوں کہ انہوں نے ہماری درخواست پر اس تقریب میں شرکت فرمائی اور ان کے بصیرت افروز خیالات کے درمیان زیادہ دیر حائل نہیں رہنا چاہتا۔ اس لیے محترم مہمان خصوصی اور حضرت ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب اور آپ سب کا شکریہ ادا کرکے اجازت چاہتا ہوں۔ شکریہ۔

اب میں ڈاکٹر ارشادالحق قدوسی صاحب کو اسٹیج پر آنے کی دعوت دے رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب ایک معروف شاعر اور ادیب ہیں اور ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے شاگرد اور مرید ہیں۔ وہ اپنے استاد اور پیرو مرشد کو ایک منظوم خراج عقیدت پیش کریں گے۔

ڈاکٹر ارشادالحق قدوسی

نحمدہٗ و نصلی علیٰ رسولہ الکریم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اساتذہ گرامی قدر اور استاذ الاساتذہ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کا میں ادنیٰ شاگرد ہوں اور پاکستان نیشنل اکیڈمی کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے مجھے اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے بلایا۔ بہت بہت شکریہ اور میں آپ حضرات کا بھی شکر گذار ہوں۔

یہ نذرانہ عقیدت ہے اور یہ دل کی گہرائیوں سے میں پیش کر رہا ہوں۔

علم کا مقصود ہی عرفان ہے
آدمیت کی یہی پہچان ہے

عرض کیا ہے!

کبریائی کبریا کی شان ہے
عجز بھی انسانیت کا مان ہے

بن گیا جو بھی غلام مصطفےٰ
بس وہی انسان تو انسان ہے

مولوی صاحب بنے مولائے روم
علم و آگاہی کا یہ فیضان ہے

عرض کیا ہے!

کیمیا ہے مصطفےٰ صاحب کا قرب
آدمی بننا کوئی آسان ہے؟

میں ہوں اک ادنیٰ غلام مصطفےٰ
یہ مرے رب کا بڑا احسان ہے

خود کو پہچانو یہی ہے راز حق
ہاں! یہی ارشاد حق کی جان ہے

عرض کیا ہے!

معرفت کی جاں غلام مصطفےٰ
اس حقیقت پر مرا ایمان ہے

☆ اور یہ ہم سب کی دعا اور ایمان ہے

مہر و الفت کا نہ ٹوٹے سلسلہ
دل ہے ہم سب کا یہی ارمان ہے
نظم ہے ارشاد حق فیضان حق
اور غلام مصطفےٰ عنوان ہے

اور مجھے بڑی سعادت حاصل ہوئی اور میں آپ سب کا شکر گذار ہوں اور یہ پیش کرنے کی سعادت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

خواتین و حضرات!

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب سندھ یونیورسٹی کے شعبہ اردو کے سابق چیئرمین اور حضرت ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کے شاگرد عزیز ہیں۔ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں حالی کا ایک شعر حضرت صاحب سے منسوب کیا تھا۔ میں اسی شعر کے اعادے کے ساتھ انہیں خطاب کی دعوت دے رہا ہوں۔

شعر یہ ہے۔

سلف کی دیکھ رکھو راستی و راست اخلاقی
کہ ان کے دیکھنے والے ابھی کچھ لوگ ہیں باقی

ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب

مہمان خصوصی جناب جسٹس صاحب مہمان گرامی جناب ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب، حاضرین کرام خواتین و حضرات!

ذکر خیر ہے اس جامع کمالات مستجمع الصفات ہستی کا جس کی پاکیزہ نفسی اور مشاغل علمی و دینی سے بھرپور زندگی کے تراسی (۸۳) سال سن عیسوی کے اعتبار سے اور ہجری کے

اعتبار سے (۸۶) چھیاسی' ایک کھلی کتاب کی طرح' تلامذہ' اساتذہ معاصرین' متوسلین' اعزا' اقرباء' دور و نزدیک کے علاقائی نیاز مندوں' چھوٹوں بڑوں کے سامنے بھی اور کم و بیش چالیس سال سے اس ناچیز کو بھی دیکھنے کی سعادت حاصل رہی۔ میری مراد مخدوم ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب ادام اللہ ایام فیضانہ سے ہے۔

حاضرین کرام! اجازت دیجیے کہ میں انہیں خیر کثیر کے پسندیدہ عنوان سے یاد کروں۔ جس کو اپنی آج کی گذارشات کا سرنامہ بنایا۔ خیر کثیر ایک تو وہ ہے جو از روئے قرآن اپنے رب کی طرف سے محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو عطا ہوئی۔ اس کی حقیقت اللہ تعالیٰ بہتر جانے۔ مگر یہاں میری مراد ان یکجا نیکیوں سے ہے جو کثرت کے ساتھ غلامان مصطفیٰ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے حصے میں آتی ہیں۔ یہ خیر کثیر ہی انعام الٰہی ہے جو استقامت کے ساتھ حیات مصطفوی کی پیروی برس ہا برس کرتے چلے جانے والوں کو ملتا ہے۔ پھر ان کی زندگیوں کے متعدد گوشے خود اپنے حق میں اور خلق خدا کے حق میں منبع خیر بن جاتی ہیں۔ وہ خود علم دین وادب سے حصہ پاتے ہیں۔ دوسروں کو بھی پہنچاتے ہیں خود بھی برکات الٰہی سے بہرہ یاب ہوتے ہیں اور دوسروں کو بھی بہرہ اندوز کرتے ہیں۔ وہ کبھی اپنے نفس کی تربیت اصلاح و ریاضت سے غافل نہیں رہتے اور دوسروں کی تربیت اصلاح و ریاضت کی خدمت بطریق احسن انجام دیتے ہیں۔ یہی ہمارے کتنے بہت سے علماء' فضلاء' صلحاء کا طریقہ رہا یہی آج اپنے محترم مکرم مخدوم کی ذات گرامی میں دیکھ رہے ہیں۔ یہ اس کا فضل ہے جسے چاہے اور جتنی حد تک چاہے نواز دے۔ اب میں اپنی سمجھ کے مطابق ڈاکٹر صاحب محترم کی پسندیدہ شخصیت کے چند پہلوؤں پر اپنے تاثرات اور مشاہدات پیش کرتا ہوں۔ جن میں عاجز کو خیر کثیر کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔

پہلی اور نمایاں بات جیسا کہ ایک موقع پر پہلے بھی عرض کر چکا ہوں وہ یہ کہ ڈاکٹر صاحب ایک کثیر الجہات شخصیت ہیں۔ تاہم شخصیت میں توازن حیرت انگیز طور پر قائم رکھا ہے۔ آپ عالم' معلم' مصنف' محقق' نقاد' مصلح' صالح' عابد' صلح کار اور کیا کچھ نہیں۔ کثرت سے سفر کرنے والے اب تو نہیں مگر پہلے بہت سفر کیے۔ ضرورتاً شعر بھی کہہ لیتے ہیں۔ قطعات تاریخ کی حد تک اور کھرا شعر کہتے ہیں۔ طب سے بھی لگاؤ ہے۔ خدمت خلق

کے لیے مشورہ بھی دیتے ہیں۔ دستیاب ہو تو دوا بھی۔ رفاع عام کے لیے اپنے خاندانی نسخے طبع کرا چکے ہیں۔ خلق خدا طرح طرح کے مقاصد لے کر کثرت سے رجوع کرتی ہے۔ مگر علمی مشاغل کے لیے بہر طور وقت نکال ہی لیتے ہیں اور پوری باقاعدگی سے جاری رکھتے ہیں۔ اور جوانوں سے زیادہ علمی کاموں کو پایہ تکمیل وقت پر پہنچا دیتے ہیں اور پھر وہ چھپ کر سامنے بھی آہی جاتا ہے۔ اس لیے اکثر اپنے احباب سے کہا کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کے وقت میں بڑی برکت ہے۔

ایک اور خوبی جس سے ڈاکٹر صاحب کو نوازا گیا ہے یہ کہ وہ کثیر اللسان ہیں۔ اردو اور فارسی پر تو وہ سند ہیں کہ وقت کے دیگر بلند پایہ اساتذہ کے علاوہ اردو میں احسن مارہروی تلمیذ داغ اور فارسی میں مولانا ضیا احمد بدایونی سے کثرت کے ساتھ مستفیض ہوئے ہیں۔ عربی بھی خوب آتی ہے۔ قرآن مجید کی آیات ازبر ہیں۔ انگریزی خوب لکھتے ہیں، تین کتابیں انگریزی میں لکھی ہیں۔ مقالات ان کے علاوہ ہیں۔ انگریزی بول بھی لیتے ہیں۔ ایک زمانے میں ڈگری کلاسوں کو پڑھاتے بھی تھے۔ یہ فیضان علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی کے اعلیٰ ماحول اور معیار کا ہے۔ ہندی اور سندھی سے بھی بقدر ضرورت واقف ہیں۔ غرض کہ چھ زبانیں آتی ہیں اور اپنے علمی تصنیفی کاموں میں اس واقفیت سے پورا فائدہ بھی اٹھایا ہے۔ اس طرح چھ زبانوں کے ماخذ منابع اور مصادر سے استفادہ کی راہ نکل آئی ہے اور علمی تگ و تاز کا میدان بھی وسیع تر ہو گیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کثیر التصانیف بھی ہیں مطبوعہ کتابوں کی تعداد ستر (۷۰) سے متجاوز ہو گئی ہے جو لکھا بفضلہ چھپ بھی گیا ہے۔ بیشتر کتابوں کی صورت کچھ رسائل کی صورت میں تدوینات کی تعداد بھی خاص ہے اور طبع زاد تصانیف کی بھی موضوعات میں حیرت انگیز تنوع ہے۔ مقالات تحقیق کی ایک قابل لحاظ تعداد نے زبان ادب کی تاریخوں پر اثر ڈالا۔ پنجاب یونی ورسٹی کے مشہور عالم اردو دائرہ معارف اسلامیہ اور تہران میں فارسی دائرہ معارف اسلامیہ میں ڈاکٹر صاحب نے بہت بلند پایہ مقالات علمی (Contribute) کیے ہیں۔ مختصر یہ کہ معیار و مقدار اور اثر انگیزی کے اعتبار سے ڈاکٹر صاحب کی کثیر مطبوعات موجب حیرت ہیں۔ کیوں کہ یہ سب علمی کام دیگر دینی اور رفاہی کاموں کی کثرت کے پہلو بہ پہلو انجام پائے۔ معتقدین، متوسلین اور مریدین کی اس کثرت

تعداد کو روزانہ جو وقت ڈاکٹر صاحب دے رہے ہیں' موجب حیرت ہے مگر اس سے بھی زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ علمی مشاغل پوری مستعدی کے ساتھ انجام پاتے رہے ہیں۔ اور پا رہے ہیں موضوعات پر نظر ڈالیے تو معلوم ہو گا کہ فارسی کے قدیم شعراء' غزنوی عہد کی تاریخ' برصغیر اور بیرون برصغیر کے فضلا کی تصانیف پر مقالات تصنیفات مشائخ نقشبندیہ کی تدوینات' شیخ عبدالحق محدث دھلوی کے احوال و آثار' بیدل عظیم آبادی مشائخ نقشبندیہ سندھ و ہند' مطالب القرآن' اقبال اور قرآن' تحقیقی منصوبات' فن تحقیق' اصول تحقیق کی تشریحات یہ سب اور ان کے علاوہ بھی ڈاکٹر صاحب کے خاص علمی میدان رہے ہیں جن میں داد تحقیق و داد تصنیف بھی ہے۔ برصغیر کے فضلاء کی اپنی علمی کاموں کے اعتبار سے اس مرتبے کو ایک کم تعداد پہنچی ہے۔ جس پر آج ڈاکٹر صاحب فائز نظر آتے ہیں۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

تلامذہ' مریدین' متوسلین' اور معتقدین کی کثرت دلالت کر رہی ہے کہ فیوض برکات کی نعمت سے خود بھی فیض یاب ہوئے ہیں اور ایک عالم کو فیض پہنچا رہے ہیں۔ وہ کثرت سے عبادت کرنے والے ہیں۔ مستجاب الدعوات ہیں اور دوسروں کی بھلائی چاہنے والے دوسروں کی مدد کرنے والے ہیں۔ حج و زیارت کی نعمتوں سے کثرت سے فیض یاب ہوئے ہیں بلکہ ان کے گھرانے کا یہ ہی انداز ہے۔ ضرور اس نیت کی کثرت دعاؤں میں اثر کو بڑھانے والی ہے۔ ان اسباب سے ڈاکٹر صاحب کی قدر دل سے کرنے والے اور اچھا کہنے والوں کی ایک کثیر تعداد ہے جو ہمہ وقت ڈاکٹر صاحب کے حق میں دست بدعا ہے۔ معاصر فضلا' تلامذہ' مریدین' متوسلین' عقیدت مند جو ایک بار ملتا ہے وہ بھی' جو تیس' چالیس' پچاس برسوں کا شناسا ہے وہ بھی۔ ڈاکٹر صاحب نے برصغیر کے تین کالجوں اور تین یونی ورسٹیوں میں پڑھایا ہے۔ پینتیس چالیس برس پڑھایا ہے۔ تلامذہ کی یہ کثیر تعداد کم و بیش اتنے ہی عرصے سے لوگوں کو خیر و فلاح کی صلاح بھی دے رہے ہیں۔ عقیدت مند بھی کچھ کم نہیں' ڈاکٹر صاحب کسی دور دراز علاقے میں بھی چلے جائیں تو کوئی نہ کوئی شاگرد یا عقیدت مند نکل ہی آتا ہے

اور کس عقیدت و محبت اور اخلاص سے ملتا ہے۔ یہ صورت حال آج کے اساتذہ سے کس قدر مختلف ہے۔ جو شاگردوں کے ہاتھوں ایذا رسانی تک سے محفوظ نہیں رہے۔ شخصی خوبیاں بھی ڈاکٹر صاحب میں کثرت کے ساتھ ہیں اور قابل تقلید بھی۔ تحمل غضب کا ہے۔ یہ فیضان سلیم الفطرتی کا تو ہے ہی' اس میں والدین اور اساتذہ اور بزرگوں کے فیض نظر کا بھی دخل ہے۔ شاگرد احباب' عقیدت مند' اعزا' متوسلین' بڑے چھوٹے' غرض کہ جو جہاں ہیں میں نے ان سب سے تحمل کا برتاؤ کرتے ہی پایا ہے۔ حالانکہ واسطہ تو کیسے کیسے تحمل شکن افراد کے ساتھ رہا ہے۔ اسی تحمل کے سبب ڈاکٹر صاحب کو روک ٹوک' نصیحت و فضیحت کرتے کم ہی دیکھا ہے۔ ہم اساتذہ اکثر اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مگر نتیجہ الٹا نکلتا ہے کیونکہ بقول اصغر ؏

آدمی نہیں سنتا آدمی کی باتوں کو

ڈاکٹر صاحب کا طریقہ کس قدر الگ ہے وہ یہی کام اپنے مثبت عمل سے لیتے ہیں۔ ان کا طرز عمل' کردار' انداز حیات اپنے اندر ایک خاموش تبلیغی صفت رکھتا ہے جس کا مثبت اثر ظاہر ہوتے بارہا دیکھا ہے۔ عملی کاموں میں اپنے شاگردوں کی کس قدر حوصلہ افزائی فرماتے ہیں اور کس قدر لحاظ رکھتے ہیں۔ علمی تربیت میں بھی ڈاکٹر صاحب کا طریقہ حوصلہ افزائی ہے۔ اپنے علمی کاموں میں اور غالباً" دوسرے کاموں میں بھی یکسوئی غضب کی ہے۔ حافظہ نہایت قوی ہے۔ بالخصوص علمی معاملات' مسائل کی جزیات میں گو کہ اب کبھی کبھی نسیان کا عذر کرتے ہیں۔ دفتری کاموں میں جب کہ وہ صدر شعبہ اردو تھے اور خطوں کا جواب دینے میں اور اپنے علمی کاموں کو جلد تر پایہ تکمیل تک پہنچانے اور مستعار کتابوں کو جلد تر واپس کرنے میں کس قدر مستعد رہے ہیں۔ خطوں کے جوابات فی الفور دینے کی عادت ہمیشہ سے رہی ہے اور باوجود پیرانہ سالی کے قائم ہے۔ حالانکہ خطوں کے روزانہ جوابات کا اوسط بیس پچیس سے کیا کم ہوگا۔ اور یہ عادت جہاں تک معلوم ہے ناسازی طبع میں بھی جاری رہتی ہے۔ کتابوں کا ایک قابل لحاظ شخصی ذخیرہ ہے جس سے علمی کاموں میں آسانی ہو گئی۔ (پچاس ہزار سے زائد کتابیں ہیں)

احباب و تلامذہ بھی مستفیض ہوتے۔ ان شخصی اوصاف حمیدہ کو مزید طول دینے کی بہت کچھ گنجائش رہی جاتی ہے جو ہمارے لیے ایک قابل تقلید نمونے کی حیثیت رکھتی ہے۔ تجوید قراءت کا ذکر تو آیا ہی نہیں، جس کی تعلیم قاری ضیاالدین احمد الہ آبادی صاحب سے جو تصانیف کثیرہ کے حامل تھے، ڈاکٹر صاحب نے پائی ہے۔ ان سب اوصاف حمیدہ نے مل کر ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کو ایک ایسے بلند بالا مقام پر پہنچایا ہے کہ ہمارے لیے کہ ہمارے بس ایک روشن منارہ نور ہیں۔ خدا سلامت باکرامت رکھے!

ایں دعا از من و عن

ترجمہ :- جملہ جہاں آمین باد

شکریہ ڈاکٹر صاحب!

محترم ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب ایک ادیب، محقق اور نقاد کی حیثیت سے ہمارے شہر کی بلکہ ہمارے ملک کی ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ وہ بھی ڈاکٹر صاحب کے مرید اور عقیدت مند ہیں۔ میں نہایت ادب اور احترام کے ساتھ دعوت خطاب دے رہا ہوں۔

ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب
"ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں کا طریقۂ رشد و ہدایت"

پیر و مرشد استاد معظم ڈاکٹر صاحب قبلہ مہمان خصوصی جسٹس ریٹائرڈ نعیم الدین صاحب، بزرگوار اور دوستو!

سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء رحمتہ اللہ علیہ نے اپنی ایک مبارک مجلس میں کسی بزرگ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ وہ ایک بار کسی خاص کیفیت سے دوچار تھے۔ کیفیت کے اختتامی لمحوں میں انہیں خیال آیا کہ اگر اسے قلمبند کر دیا جائے تو بہت اچھا ہو۔ چنانچہ وہ قلم دوات لیے ساری زندگی اسی کوشش میں مصروف رہے۔ لیکن ایک لفظ بھی نہ لکھ سکے۔

جملہ شاہ بود کہ اثبات ــــــــــ

اے مکانم ----- عجب کہ تشنہ دھانم ------ سفال ریحانم

لیکن جب بھی اس عاجز نے استاذی مرشدی ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب کے طریق رشد و ہدایت کے بارے میں کچھ لکھنے کا ارادہ کیا تو یہی صورت حال پیش آئی۔ کیا لکھوں! کیسے لکھوں! کیونکر لکھوں! کبھی کبھی یہ خیال بھی آیا۔

چنانچہ قلم سنبھالا مگر ایک دوسری مشکل پیش آئی۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ کا شمار اولیاء میں ہوتا ہے اور آلا انّا اولیاءَ اللہ لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔

ولی کی ولایت کی معنویت بھی دو انداز سے ہے۔ ایک ہے ولایت بفضل غایت ولایت کی معنویت یہ ہے کہ طاعت سے ذوق حاصل ہو اور طریقت سے آراستہ ہے۔ یعنی جو کچھ اس کے اور خلق خدا کے مابین ہے وہ ہے ولایت اور ولایت وہ جو اس کے اور اللہ کے مابین ہے اور خاص محبت جب شیخ دنیا سے نقل کرتا ہے تو اپنی ولایت اپنے ہی ساتھ لے جاتا ہے۔ لیکن ولایت کسی دوسرے کے ساتھ لے جاتا ہے۔ اب مشکل یہ ہے کہ یہ عاجز جو کچھ بیان کرے گا وہ محض ولایت کے حوالے سے ہوگا۔ کیونکہ ولایت کی تعبیر کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ کی خدمت میں اس عاجز کی نیازمندی کم و بیش نصف صدی پر محیط ہے۔ ایک طالب علم کی حیثیت سے نیاز حاصل ہوا تھا۔ اور اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب قبلہ کی شفقت و بزرگی اور علمی اقدع سے مرعوب ہونے کے باوجود اور اپنی ذہنی اور روحانی پسماندگی کے باعث دور ہی رہنے میں عافیت محسوس ہوتی تھی۔ یہ عاجز اس زمانے میں ریڈیو سے وابستہ ایک ذہنی خوش باش اور انجام سے بے خبر انسان تھا۔ دریا کنارے پہنچنے کے باوجود تشنہ کامی کو اپنا ہنر اور فن گردانتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے بھی اپنی غیر معمولی شفقت کے باوجود کبھی یہ نہیں دریافت کیا کہ میاں تمہارے منہ میں کیسے دانت ہیں؟ کہاں رہتے ہو؟ کیا کرتے ہو؟ حد یہ کہ بعض اوقات شام کو ڈاکٹر صاحب قبلہ بالعموم پیر کالونی کی مسجد میں ہوتے۔ یہ عاجز کبھی انتظار میں سڑک پر ٹہلتا رہتا۔ کبھی مسجد میں جاکر بیٹھ جاتا۔ اپنے کو ملامت کرتا رہتا۔ سارے وقت شرمندگی کی ایک کیفیت طاری رہتی۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ کو نماز میں مشغول دیکھتا۔ فرض ادا ہوئے سنت پڑھی، نفل پڑھی۔ پھر بیس رکعت نفل مغرب کی ادا ہوئے۔ نماز سے فارغ ہو کر اس عاجز کی طرف متوجہ ہوئے۔ تعجب یہ ہے کہ ایک دفعہ

بھی یہ ارشاد نہیں ہوا کہ آخر تم نماز کیوں نہیں پڑھتے۔ یہ حسرت بھی رہی کہ صرف ایک مرتبہ ٹوک دیتے کہ بھائی تم بھی نماز پڑھ لیا کرو۔ مگر یہاں کسی قسم کی روک ٹوک سرے سے تھی ہی نہیں۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ کے حلقے کے بعض اور بزرگوں سے بھی نیاز حاصل ہوا۔ صوفی محمد احمد بڑے نیک اور خدا ترس مگر گاہے گاہے ٹوک دیا کرتے تھے۔ حاجی محمد اعلیٰ صاحب [redacted] بھی ڈاکٹر صاحب کی طرح خاموش رہتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ کا رویہ کہ غیر معمولی شفقت فرماتے۔ ہر بات پر مسکراتے۔ مگر تلقین نہیں فرماتے تھے۔ اس عاجز نے کبھی کبھی ڈاکٹر صاحب کی شگفتگی اور مسکراہٹ میں یہ ضرور محسوس کیا جیسے ان میں پیغام بھی ہے معنی خیز اور فکر انگیز، تمہیں چھوٹ دی گئی ہے گمراہوں کی طرح راہی شک میں سیر کرتے رہو۔ مگر کیا تمہیں آنا نہیں ہے اور ہوا بھی یہی کہ وہیں جانا پڑا۔ بدیر سہی مگر دیر آید درست آید

ع پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا

ابتدا بدگمانی سے ہوئی تھی۔ انتہا یہ کہ از راہ بندہ پروری مخبطین میں شمار کیا گیا۔

فلحو اسلمو و بشرالمخبطین

عاجز کرنے والوں کو جنت کی خوش خبری سنادو۔

شروس عالم۔ کہ مسشر دھا۔ است

یہ آنے والی بات کی اصل بات ہے۔ اس عاجز کو احساس ہوتا ہے کہ اصلاح احوال کے بھی کئی طریقے ہیں۔ بزرگان کرام افراد کی ذہنی کیفیات کے اعتبار سے اصلاح کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ بعض طبائع فوری طور پر متاثر ہو جاتے ہیں۔ کوئی چالیس برس ہوئے اردو کالج کے ایک استاد نے مجھ سے کہا یہ آپ کے ڈاکٹر صاحب بڑے عجیب آدمی ہیں۔ کالج کے دو بڑے ہونہار طالب علم فوری طور پر ان کے رنگ میں رنگ گئے ہیں۔ وہی وضع قطع اختیار کرلی ہے اور اسی رنگ میں ڈوبے نظر آتے ہیں۔ ان میں سے ایک مخدومی شعور احمد فاروقی تھے۔ حکومت پاکستان میں کسی اچھے عہدے پر مامور تھے۔ دوسرے مرحوم ڈاکٹر سید سخی احمد

ہاشمی۔ دونوں ڈاکٹر صاحب سے ہدایت پاکر اہل عالم کی اصلاح کرتے رہے۔ فوری طور پر متاثر ہونے کی وجہ دونوں کا نظری اور فطری ذوق و شوق اور ڈاکٹر صاحب قبلہ کی نگاہ انسان شناس تھی۔ شیخ بہاؤ الدین زکریا ملتانی رحمتہ اللہ علیہ، شیخ شہاب الدین سہروردی کی خدمت میں صرف (١٧) سترہ دن حاضر رہے۔ سترویں دن خلافت سے نوازے گئے۔ دوسرے مریدین نے شکایت کی تو جواب ملا کہ تم گیلی لکڑیاں ہو آگ نہیں پکڑے۔ زکریا رحمتہ اللہ علیہ خشک لکڑیاں لائے تھے۔ ایک ہی پھونک میں شعلہ بن گئے۔ غالباً" یہی صورت حال یہاں بھی پیش آئی کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کے نفس ظن سے ایک ہی دفعہ لکڑیوں میں آگ بھڑک اٹھی۔ تر دامنوں کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے کہ گھوم پھر لو باری تمہاری بھی آئے گی۔ اردو کالج کے استاد محترم نے اس صورت حال کو اپنی مزید خرابی سے تعبیر کیا۔ بات وہی کمال انسانیت کی کہ شعور احمد فاروقی صاحب رشد و ہدایت کی منزل پر فائز ہوئے اور ڈاکٹر سید سخی احمد ہاشمی جنت المعل ی میں خوابیدہ ہو کر ہم سب کے لیے باعث رشک بنے۔ اس عاجز کا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کا طریقہ رشد و ہدایت بڑا پہلو دار ہے۔ اس عاجز نے ڈاکٹر صاحب قبلہ کو کبھی کسی کو تلقین کرتے یا ٹوکتے نہیں دیکھا۔ اکثر ایسا ہوا کہ کوئی دوست ہمراہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پہلی ہی ملاقات میں اس حد تک متاثر ہوا کہ بیعت سے مشرف ہو گیا۔ ایک دفعہ یہ عاجز ڈاکٹر صاحب قبلہ کی خدمت میں حاضری دینے حیدر آباد جا رہا تھا۔ ایک شاعر دوست بھی ساتھ ہو گئے۔ حیدر آباد پہنچے نیاز حاصل ہوا تو ایسے الجھے کہ بیعت کیے بغیر نہیں اٹھے۔ بے شمار واقعات اس طرح کے ہوئے بیان ہو تو ایک دفتر ہو جائے۔ لطف یہ کہ ان حضرت میں بیشتر ایسے تھے جو ڈاکٹر صاحب قبلہ کی خدمت میں پہلے پہل حاضر ہوئے۔ اور اس عاجز کے سامنے ان کی ان سے کوئی تفصیلی گفتگو بھی نہیں ہوئی۔ بس نگاہ اولین والا معاملہ تھا۔ نگاہ کی ایسی ہی تابش میں نے ہمیشہ یہ دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب نگاہیں نیچی رکھتے ہیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کسی سے بات نہیں کرتے۔ کسی کو ٹوکتے نہیں۔ للکارتے نہیں۔ مگر اللہ جانے کیا بات ہے کہ جو حاضر ہوتا ہے حلقہ بگوش ہو جاتا ہے۔ جب اس مسئلہ پر بہت غور کیا۔ دو ایک دفعہ ہمت کر کے ڈاکٹر صاحب ہی سے دریافت کیا مگر وہاں جواب میں صرف مسکراہٹ بھی ملی۔ سمجھ میں یہ آیا کہ مومن بیک وقت دس انوار کا حامل

ہوتا ہے۔ نور روح، نور عقل، نور معرفت، نور وقوف، نور کیفیت، نور بصر، نور حیا، نور محبت اور نور شوق، انوار کے اس تبصرے میں ارشاد ربانی نے مزید اجالا پھیلا دیا۔ نور علیٰ نور۔ اللہ جس کو چاہتا ہے راہ دکھاتا ہے۔ اور اللہ لوگوں کے سمجھنے کے لیے مثالیں بیان فرماتا ہے اور اللہ ہر چیز کے احوال سے واقف ہے۔ سالک کو جس نور کی ضرورت ہوئی وہی رخ اس کے سامنے آگیا۔ اور ہمیشہ کے لیے حلقہ بگوش ہوگیا۔ جس نور کی ضرورت اسی نور کی چھوٹ پڑنے لگی۔ چلیے کام بن گیا۔ مگر یہ خیال اس عاجز کا ہے ضروری نہیں کہ درست ہی ہو۔ اصل بات یہ ہے کہ دلوں کا معاملہ ہے اور دلوں کے مسائل ہیں۔ اس پر یاد آیا کہ روح جب کمال کو پہنچتی ہے تو قلب کو جذب کرلیتی ہے اور قلب جب کمال کو پہنچتا ہے تو قالب کو جذب کرلیتا ہے۔ جذب انجذاب کا یہ سلسلہ بڑا زبردست ہوتا ہے اور بقول شاعر

ع کھلی جب فصد لیلیٰ کی تو خون مجنوں کے بہہ نکلا

بزرگان کرام بھی آنے والوں کے ساتھ یہی عمل کرتے ہیں اور قلب، قالب روح سب کو اپنی طرف متوجہ کرلیتے ہیں۔ اس کا عملی مظاہرہ میں نے جلسے میں دیکھا۔ نہایت معذرت کے ساتھ ---------- یہ جلسہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کے اعزاز میں ہوا تھا۔ صاحب صدر کچھ منحرف قسم کے بزرگ تھے۔ طوعاً" و کرہاً" مسند صدارت پر بیٹھے۔ غالباً" ان کی ناخوشی کا احساس ڈاکٹر صاحب کو بھی ہوگیا تھا۔ ارشادات صدر کی باری آئی تو منحرف صدر پر گریہ طاری ہوگیا۔ بڑی مشکل سے آنسوؤں اور ہچکیوں میں صرف اتنا کہہ سکے کہ میں ڈاکٹر صاحب قبلہ کے مرتبے سے ناواقف تھا۔ بعد میں یہ بزرگ اس عاجز کے ہمراہ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حیدر آباد حاضر ہوئے اور ان پر وہی پہلی والی کیفیت طاری ہوگئی۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے زبان مبارک سے ایک لفظ بھی نہیں فرمایا۔ نہ کوئی تلقین کی، نہ نصیحت بس ایک جذبہ سامنے آیا۔ اور بے خودی طاری ہوگئی۔ بے خودی بھی ایسی کہ پھر انسان مکروہات سے تائب ہوجاتا ہے۔ یونی ورسٹی کے شعبہ ریاضیات کے ایک طالب علم ایک دفعہ اس عاجز سے ملے اور یہ کہا کہ کوئی ٹیوشن دلوا دیجیے۔ وہ بڑے ہونہار اور لائق طالب علم تھے۔ ٹیوشن کا بندوبست کردیا گیا۔ محنت سے پڑھاتے رہے...

ملازم ہوگئے اور ساتھ ہی شام کو شادی بیاہ اور تقریبات کی ویڈیو فلمیں بنانے لگے۔ یہ کام بھی اچھا چلا۔ ایک بار ضرورتاً انہیں بلایا۔ کہیں ویڈیو فلم بنوانے کا پروگرام تھا۔ وہ فوراً آئے مگر حلیہ بدلا ہوا تھا۔ چہرے پر داڑھی تھی۔ کہنے لگے حیدر آباد جا کر ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں صاحب کا مرید ہوگیا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ کیونکہ تصویر کشی پسند نہیں کرتے اس لیے ویڈیو کا کام چھوڑ دیا ہے۔ دریافت کیا کیا منع کیا ہے؟ کہنے لگے منع کرنے کا کیا سوال! انہیں تو معلوم بھی نہیں ہے کہ میں کیا کام کرتا تھا۔ بس میں نے خود ہی پیر و مرشد کی خوشنودی حاصل کرنے کے خیال سے یہ کام ترک کر دیا ہے۔ حاصل اس واقع کا یہ کہ ڈاکٹر صاحب قبلہ کے کسی نور کی ایسی چھوٹ پڑے کہ مرید کا قلب منور ہوگیا اور وہ ایک برائی سے ہمیشہ کے لیے تائب ہوگیا۔

ع یہ فیضان نظر تھا یا کہ مکتب کی کرامت تھی

نجانے ایسے اور کتنے ہوں گے جو اس طرح سدھر گئے ہوں گے۔ بے شمار لوگوں کو خود اس عاجز نے ان گناہ گار آنکھوں سے تائب ہوتے اور بہتر زندگی گذارتے دیکھا ہے۔ بزرگوں کا فرمان ہے کہ صحبت کا اثر ہوتا ہے ...... ہوتا ہے اور یقیناً ہوتا ہے۔ آج کی جدید اصطلاحوں کے مطابق یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ذہنی تشکیل اور کردار سازی کے عمل میں سب سے موثر ذریعہ بزرگ والدین اور اساتذہ کا اور ہم نشینوں کا مثبت رویہ' ہمدردانہ سلوک اور بہتر مفاہمت ہے۔ یہ آج کی بات نہیں .... کل کی بات بھی کچھ اس سے مختلف نہیں تھی۔ خاندان اساتذہ اور ہم نشینوں سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے پیر و مرشد کا فیض صحبت اسے دوچند کر دیتا ہے اور مرشد کی شخصیت تو خلق محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک مضبوط حوالہ ہوتی ہے۔ مرید کے قلب کو منور کر کے ایک بہتر انسان بنا دیتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ نے یہ فریضہ بطریق احسن انجام دیتے ہیں اور نرم خو ہیں۔ خوش خلق ہیں۔ صبر و تحمل کا پیکر ہیں۔ شخصیت سے حیا اور ایمان کا نور جھلکتا ہے۔ روادار ہیں' مہمان نواز ہیں بہت بڑے عالم ہونے کے باوجود مزاج میں انکسار ہے۔ علم کا کوئی ادعا نہیں ہے۔ شگفتہ جبیں عبادت گزار' پابند شرع اور جن کی عبادت اور تقویٰ کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔

عبد و معبود کے سلسلے سے ہے۔ لہٰذا اس بارے میں کچھ کہنا اس عاجز کا منصب نہیں۔ چشم ظاہر کچھ دیکھنے اور برداشت کرنے کی ہمت نہیں رکھتی۔ دیکھا تو یہ دیکھا کہ وہ لوگ جو عام زندگی میں دین کی اہمیت کے منکر ہیں ڈاکٹر صاحب قبلہ کے حضور پہنچتے ہیں تو با ادب ملاحظہ ہوشیار رہتے ہیں۔ اٹھتے ہیں تو پھر وہی کیفیت خوئے انکار میں ذرا دیر کے لیے نرمی پیدا ہوتی ہے۔ اس سلسلے میں وجہ تو بہت پہلے بیان ہو چکی ہے۔ قلب و چشم و گوش مہریں لگی ہوں تو کوئی تدبیر کام نہیں آتی۔ ہاں فیض صحبت سے چند لمحوں کے لیے خوئے انکار میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں ایک پر لطف واقعہ ذہن میں محفوظ ہے۔ واقعات تو بے شمار ہیں لیکن یہ واقعہ ذرا دلچسپ ہے۔

ایک شاعر پہ جب کراچی میں عرصہ حیات تنگ ہوا تو انہوں نے حیدر آباد میں ڈیرہ جمایا اور دیکھتے ہی دیکھتے سندھ کے بابائے اردو ہونے کے مدعی ہو گئے۔ ایک بار ملاقات ہوئی تو کہنے لگے یہ تمہارے ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب بڑے عجیب آدمی ہیں۔ ہماری ان سے لڑائی ہے۔ عرض کیا گیا کہ لڑنے کے لیے دونوں فریقوں کی موجودی ضروری ہوتی۔ ڈاکٹر صاحب قبلہ یہ کام نہیں کرتے پھر لڑائی کیسی؟ بولے ان کے یہاں دین ہی دین ہے ادب نہیں۔ عرض کیا شکر کیجیے دین تو ہے ورنہ تو لوگوں کے ہاں نہ دین ہے نہ ادب۔ کچھ دنوں کے بعد پھر نیاز حاصل ہوا۔ فرمانے لگے۔ بھئی تمہارے ڈاکٹر صاحب تو واقعی بڑے عجیب آدمی ہیں۔ عرض کیا آپ نے کیا جدال کا کوئی نیا پہلو دریافت کر لیا ہے؟ بولے نہیں یہاں تو ادب بہت ہے۔ ایک آدھ دفعہ تو مجھے احساس ہوا کہ ادب ہی ادب ہے۔ قدیم اور جدید دونوں پر بڑی گہری نظر ہے اور تحقیق کے تو بادشاہ ہیں۔ معاً اس عاجز کو یہ خیال آیا کہ پہلے جس نور کی چھوٹ پڑی تھی وہ نور معرفت تھا۔ دوبارہ جس نور سے آشنا ہوئے وہ نور علم تھا۔ نور علم اپنا کام کر گیا کیونکہ

قدر مجموعہ گل مرغ سحر داند و بستہ
کہ نہ ہر ورق ساں معنی دار در

معانی کا فہم صرف اہل اللہ کو عطا ہوا ہے۔

؎ این دولت سرمد کس تا نادھد

صاحبو!

ڈاکٹر صاحب قبلہ کی طریق رشد وہدایت کی داستان اتنی لذیذ اور پر کیف ہے کہ یہ عاجز بقول شیخ شیراز

بزبان حرف جز بند بے رود حدیث عشقت
چو معاملہ نہ دارد سخن آشنانہ باشید

اس داستان کو پہروں بیان کرسکتا ہوں۔ لیکن جب تشریف فرما صاحبان علم، صاحبان دل، صاحبان منصب اور صاحبان عزوجاہ اور صاحبان فضل وکمال پر نظر ڈالی جاتی ہے تو بے اختیار یہ خیال آتا ہے کہ یہ سب حسن نیت، خلوص اور محبت سے یہاں آئے ہیں۔ اور ڈاکٹر صاحب قبلہ کے احترام میں سکون اور خاموشی سے بیٹھے اکتساب فیض کررہے ہیں۔ کیا اس سے ڈاکٹر صاحب قبلہ کے رشد وہدایت، فیض رسانی اور رہنمائی کا ایک عملی نمونہ سامنے نہیں آتا؟ .... آتا ہے اور ضرور آتا ہے۔ یہ عاجز اپنی بے بضاعتی کے باوجود اس اجالے کو محسوس کررہا ہے جو یہاں پھیلا ہوا ہے۔ وہ خوشبو جو مشام جان کو مسحور کررہی ہے۔ وہ دلنواز کیفیت جس نے دلوں کو بے خود کردیا ہے۔ یہ سب محسوس ہوتا ہے اور ڈاکٹر صاحب قبلہ کی طرف رخ کرکے نہایت ادب اور احترام کے ساتھ یہ شعر پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

سب خواتین وحضرات باآواز بلند کہیں آمین ثم آمین۔

وآخر دعوانا عن الحمدللہ رب العالمین۔

شکریہ ڈاکٹر صاحب

خواتین وحضرات!

ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک صاحب ہمارے عہد کے ان معدود چند بزرگوں میں سے ہیں جنہوں نے اسلامی تعلیم کی سائنٹیفک توجیح پیش کر کے مغرب زدہ حلقوں کو چونکا کے رکھ دیا۔ ہم سب ان کی علمی بصیرت اور جوش خطابت کے معترف ہیں۔ ملک صاحب بطور خاص اس تقریب میں شرکت کے لیے لاہور سے یہاں تشریف لائے ہیں اور ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے مرید بھی ہیں۔ انہیں دعوت خطاب دیتے وقت مجھ عاجز کو ایک شعر یاد آرہا ہے۔ میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کے حوالے سے

تمہارے شہیدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل و لالہ و ارمغاں کیسے کیسے

اور میرا جی چاہ رہا ہے کہ حضرت صاحب کے احترام میں اس شعر کو یوں پڑھوں کہ

تمہارے مریدوں میں داخل ہوئے ہیں
گل لالہ و ارمغاں کیسے کیسے

خواتین و حضرات ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک صاحب اب آپ کے سامنے اظہار خیال فرمائیں گے۔

ڈاکٹر غلام مرتضٰی ملک صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ الصلوۃ والسلام علیٰ محمد وعلیٰ آلہ واصحابہ اجمعین

اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

واجب صد احترام مخدومی و مرشدی قبلہ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفٰے خان صاحب مہمان گرامی، جناب جسٹس نعیم الدین صاحب، معزز خواتین و حضرات ۱۹۶۳ء کی بات ہے۔ میں گورنمنٹ کالج کوئٹہ میں فلسفہ کے استاد کی حیثیت سے (Lecturer in Philosopy) کام کر رہا تھا۔ وہاں لیاقت بازار کے قریب ایک مکان میں میری رہائش تھی۔ صبح کی نماز پڑھنے مسجد کو گیا۔ سنتوں سے فارغ ہو کر نماز کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک سفید ریش بزرگ نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے۔ نماز پڑھی لیکن جب قرآن مجید کی تلاوت سنی تو مجھ پر عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ وہ کیفیت جو اس سے پہلے کبھی طاری نہیں ہوئی تھی۔ میں نے بچپن ہی میں تجوید اور قراءت سیکھی تھی۔ قرآن مجید پڑھنے کا ایک ذوق تھا۔ بچپن ہی سے۔ لیکن یہ جو میں نے قرآن مجید سنا پہلی رکعت اور دوسری رکعت میں تو یہ وہ نہیں تھا جو میں پڑھتا چلا آرہا تھا۔ یہ زینہ

از دل خیزد بر دل ریزد کے مصداق

پوری تلاوت کے دوران مجھ پر رقت طاری رہی۔ شدید گریہ کے دوران ایسی کیفیت طاری رہی۔ نماز کے بعد میں نے وہاں دوستوں سے پوچھا۔ یہ کون بزرگ ہیں اور آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ جس طرح آج نظر آرہے ہیں ۱۹۶۳ء میں بھی یہی وجاہت تھی۔ تو پتہ چلا کہ یہ ڈاکٹر غلام مصطفٰے خاں صاحب ہیں جو حیدر آباد سے گرمیوں کی چھٹیاں گذارنے کے لیے یہاں آئے ہیں۔ بات یہ ہے کہ دل تو ہم نے اسی دن دے دیا تھا۔ ہاتھ دینے کی جراءت نہیں ہوئی۔ بہت عرصے تک حتیٰ کہ اس دن بھی میں ٹکٹکی باندھ کر دیکھتا رہا۔ لوگ قریب قریب جاکر مصافحہ بھی کرتے رہے، معانقہ بھی کرتے رہے اور میں اس قدر مرعوب ہوا کہ

سچی بات یہ ہے کہ میں مصافحہ بھی نہ کر سکا۔ نماز روز پڑھتا رہا اور محبت سے روانہ دیکھتا رہا اور محبت سال ہا سال بڑھتی رہی۔ اور محبت میں ایسا کہ بچپنا حضرت کے شیخ مولانا زوار حسین رحمتہ اللہ علیہ ہمارے شہر میں تشریف لایا کرتے تھے۔ بھاولپور میں ان کی زمین تھی۔ خیرپور ٹامے والی میں مولانا خورشید نعمانی کے گھر میں مہمان رہا کرتے تھے میں حضرت سے ملتا تھا اور ان سے کہا کرتا تھا ڈاکٹر صاحب سے میرا سلام کہہ دیجئے گا۔ ڈاکٹر صاحب کیا جانیں میں کون ہوں؟ آخر وہ گھڑی بھی آگئی الحمد للہ ثم الحمد للہ میں نے دونوں ہاتھ بھی حضرت کے حوالے کردیے۔ اور باقاعدہ بیعت کی۔ میں سمجھتا ہوں کہ میری زندگی کے قیمتی ترین لمحات میں سے ایک لمحہ تھا۔ لیکن اس کے بعد بھی سچی بات کہ جو شیخ سے مرشد سے استفادہ ہونا چاہیے وہ اس لیے نہیں ہوسکا کہ حضرت صاحب کے جلال کی اور رعب کی کیفیت طاری رہی اور حضرت کی بے پناہ شفقت کہ مجھے حفیظ جالندھری کا شعر یاد آجاتا ہے ؎

جس کو مجھ میں بھی کوئی بات نظر آتی ہے
اے خدا ایک تری ذات نظر آتی ہے

حضرت سے جو شفقت مجھے ملی میری نالائقی کے باوجود اور ہر غفلت کے باوجود' میں سمجھتا ہوں کہ ان ہی کا ہاتھ ہے۔ وہ اختر شیرانی نے نجانے اپنے کس محبوب کے بارے میں کہا تھا مگر آپ کے بارے میں کہتا ہوں کہ ؎

مجھے اپنی پستی کی شرم ہے تری رفعتوں کا خیال ہے
مگر اپنے دل کو میں کیا کروں اسے پھر بھی شوق وصال ہے

عزیزان گرامی! بات یہ ہے کہ میں سوچتا رہا کہ ایک شخص جو اس قدر بے نفس ہے' اس قدر متواضع' اس قدر شفیق' لیکن اس کی شخصیت میں اس قدر رعب کیوں ہے اس قدر زور کیوں ہے؟

مجھے جگر مراد آبادی کا ایک شعر یاد آتا ہے ؎

میرا کمال شعر بس اتنا ہے اے جگر
وہ مجھ پہ چھا گیے میں زمانے پہ چھا گیا

حضرت نے اپنے دل میں اپنے قلب پہ اپنے قالب پہ اللہ کی ذات کو چھا جانے کا موقع دیا۔ میں نے ذکر کی اتنی گہری کیفیات بہت کم دیکھی۔ کل کی بات ہے میں شاہراہ فیصل پر کہیں جا رہا تھا۔ گاڑیوں کا بہت رش محسوس ہوا۔ مجھے ایک بات اچانک دل میں آئی۔ وہ یوں کہ ہزاروں کی تعداد میں گاڑیاں ادھر ادھر جا رہی ہیں اور ظاہر ہے کہ اس چلت پھرت میں ایک ہی مقصد ہے انسان کی معاشی ضرورتیں' ملازمت ہے' تجارت ہے' زراعت ہے۔ میں سوچتا رہا کہ یہ سب گاڑیاں صرف ایک مقصد کے تحت چل رہی ہیں۔ پیسہ کمانا ہے' ضروریات کو پورا کرنا ہے۔ پھر خیال آیا کہ نہیں...... ان گاڑیوں میں چلتے چلتے ہزاروں گاڑیاں گذر گئیں۔ پھر ڈیڑھ دو ہزار میں ایک آدھ گاڑی تو ایسی ضرور چلتی ہو گی جس کا سفر اللہ کی خاطر ہو گا' ضرور ہو گی۔ ایک آدھ گاڑی خواہ وہ دو ہزار کے بعد آجائے ایک مسافر تو ایسا ضرور ہو گا جس کا سفر صرف پیٹ کی خاطر نہیں ہو گا۔ صرف معاش کی خاطر نہیں ہو گا۔ معاش کو اس نے درجہ ثانویہ عطا کر دیا ہو اور اللہ کی ذات کو اس نے اولین ترجیح قرار دے دیا ہو۔ اسی کو محبوب حقیقی ٹھہرا لیا ہو۔ اس کا سفر صرف اس کی بارگاہ میں ہو۔ ایک آدھ گاڑی تو ان میں ضرور ہو گی۔ پھر خیال آیا کہ اچھا اگر اڑھائی تین ہزار گاڑیوں کے بعد ایک گاڑی ایسی آتی ہے اس گاڑی کا مسافر اللہ کو کتنا پیارا لگتا ہو گا! اڑھائی تین ہزار گاڑیوں کے بعد ایک مسافر تو ایسا نکل آیا جو سچ مچ کا شہسوار ہے۔ اس کے بعد جب شہسوار کا خیال میرے ذہن میں آیا تو میں سچ کہتا ہوں مجھے ڈاکٹر صاحب یاد آگئے۔ وہ لوگ جن کی پوری زندگی صرف اللہ کی خاطر ہوتی ہے۔ جن کا اٹھنا بیٹھنا' چلنا پھرنا' جن کی عبادت تو عبادت ہوتی ہے ان کی تجارت بھی عبادت ہوتی ہے۔ جن کا سونا بھی عبادت ہوتا ہے۔ جن کا کھیل کود بھی عبادت ہوتا ہے۔ ان کی سیر بھی عبادت ہوتی ہے۔ لوگوں کے ساتھ شگفتہ مزاجی بھی عبادت ہوتی ہے۔ ان کا ایک ایک پل ایک ایک لمحہ' سب کچھ عبادت ہوتا ہے۔ یہی بات یہ ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب کو ان ہی لوگوں میں سے شمار کرتا ہوں اور ایک اور بات بھی ذہن میں آئی کہ یہ ایک سوار اور یہ ایک گاڑی جو اللہ کی خاطر چل رہی ہے اگر یہ نہ ہوتی تو یہ اڑھائی تین ہزار گاڑیاں بھی نہ چلتیں۔ وہ اس آدمی کی وجہ سے' اس گاڑی کی وجہ سے جو اللہ کی خاطر اپنے اسٹیرنگ کو لیے

ہوئے جارہا ہے۔ یہ بقیہ اڑھائی تین ہزار گاڑیاں بھی چل رہی ہیں۔ اسی کی وجہ سے اس کی برکت ہے۔

عزیزان گرامی!

ہم لوگ بطور طالب علم کے ایک مسئلہ بیان کیا کرتے ہیں۔ اس مسئلے کو ذرا غور سے سنیے۔ بہت اہم مسئلہ ہے۔ ہم کہا کرتے ہیں کہ دین کے اندر ایک تواتر ہے' ایک تسلسل ہے۔ قرآن مجید میں ایک تواتر ہے ایک تسلسل ہے' سنت طیبہ میں' سیرت طیبہ میں حضور کے زمانے سے لے کر اب تک ایک تواتر ہے ایک تسلسل ہے اور وہ تواتر تین راستوں سے ہے۔ بہت اختصار کے ساتھ ایک بات عرض کروں گا وہ تواتر کیا ہے؟ وہ تسلسل کیا ہے؟ جس میں کوئی گیپ نہیں۔ مثلاً حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پہ قرآن مجید کی آیات نازل ہوئیں۔ آپ نے فوراً" پڑھ کر سنادیں' آپ کو فوراً" خود ہی یاد ہو گئیں۔ آپ کو حفظ کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی کہ قرآن حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے قلب پر نازل ہوتا تھا۔ یاد ہوجاتا تھا۔ اجازت ہی نہیں تھی کہ زبان ہلائیں اس کو دہرائیں۔ لا تحرک .... قرآن۔

قرآن کو یاد کرنے کے لیے زبان کو ہلانے کی ضرورت نہیں۔

حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو یاد کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ قلب پہ وارد ہوتا تھا۔ قلب پہ نازل ہوتا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو تو وہیں حفظ ہو گیا۔ سنایا آگے جماعت بیٹھی ہوئی عشاق کی۔ انہوں نے یاد کرلیا۔

طبقہ صحابہ کا وہیں پیدا ہوگیا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک حفاظ کا طبقہ آج تک چلا آرہا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے سے لے کر ایک دن کیا ایک منٹ بھی ایسا نہیں آیا کہ حفاظ موجود نہ ہوں۔ ہمیشہ حافظ موجود رہے۔

نمبر ۲۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم پر آیات نازل ہوئیں آپ نے پڑھ کر سنائیں۔ کاتبین وحی کی ایک جماعت موجود ہے۔ انہوں نے فوراً" لکھ لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کو حضرت جبرئیل علیہ السلام نے اس آیت کو قرآن۔ فلاں سورۃ میں فلاں آیت سے

پہلے یا فلاں آیت کے بعد نقل کردو نقل ہو گئی۔ قرآن مجید حضور کے زمانے میں مکمل طور پر مرتب ہو گیا۔ کتابت میں آ گیا۔ اس دن سے لے کر آج تک پورے کا پورا قرآن مجید لکھی لکھائی شکل میں ہمیشہ موجود رہا ہے۔ ایک دن بھی اور ایک منٹ بھی امت مسلمہ میں ایسا نہیں آیا کہ جب قرآن مجید لکھی لکھائی شکل میں کہیں مفقود ہو گیا ہو یا کہیں غائب ہو گیا ہے۔

دو سری چیزیں ہو گئیں۔ ایک تیسری چیز تواتر کی اور تسلسل کی

کہ اللہ کا کلام نازل ہوا اور آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اس پر عمل کر کے دکھایا۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس پر عمل کیا۔ صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ پانچ لاکھ کی تعداد' سب نے اس پر عمل کیا۔ قرآن مجید پورے کا پورا روبہ عمل آ گیا۔ انفرادی طور پر اجتماعی طور پر' اور ایک جماعت قرآن پر عمل کرنے والی' اس پر جان چھڑکنے والی۔ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے زمانے سے لے کر آج تک تواتر اور تسلسل کے ساتھ بغیر کسی وقفے کے بغیر کسی گیپ کے ہمیشہ موجود اور یہ حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کا مژدہ ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے اشارہ بھی دیا تھا کہ ہمیشہ موجود رہیں گے اور حالات جیسے ہی دگرگوں ہوں اس جماعت کا کبھی کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکے گا۔ ایک اللہ والوں کی جماعت' قرآن والوں کی جماعت دنیا میں ہمیشہ ہر دور میں موجود رہے گی۔ میں ابھی بھی یہ بات اپنے کلاس روم میں بیان کرتا ہوں۔ وہ کہتے ہیں۔ کہاں ہیں جی۔ میں کہتا ہوں جاؤ حیدر آباد میں دیکھ لو۔ وہ قرآن کے راستے سے ملتی ہے۔ وہ شیخ طریقت کے راستے سے ملتی ہے۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا کہ ؎

اگر کوئی شعیب آئے میسر شبانی سے کلیمی دو قدم ہے

تو شعیب اگر میسر ہے اور آدمی پھر بھی کلیمی حاصل نہ کر پائے تو یہ بدنصیبی کی بات ہے۔ وہ کہا ہے کہ ؎

کسی کے ہو رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

عزیزان گرامی! اگر اللہ تعالیٰ موقع دے دے اور میں سمجھتا ہوں کہ کراچی کے لوگ خوش بخت ہیں حیدر آباد کے لوگ اور بھی خوش بخت ہیں میں کبھی کبھی سمجھتا ہوں کہ ہمیں ڈاکٹر صاحب کا زمانہ حاصل ہوا۔ ایسی شخصیتیں نہیں ملا کرتیں۔ ایک دور گذر جاتا ہے وہ لوگ ہم نے شوخی میں کھودیے۔

ڈھونڈا تھا آسمان جنہیں خاک چھان کے

عزیزان گرامی!

اس موقع سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اور ان حضرات کی صحبت سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اس لیے آخری بات عرض کرتا ہوں۔ اس بات کا علم تو ہر شخص کو ہوتا ہے کہ یہ خیر ہے یہ شر ہے لیکن اتنا کافی نہیں ہے۔ اعضاء جوارح ساتھ نہیں دیا کرتے۔

جانتا ہوں ثواب طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

بات یہ ہے کہ طبیعت کو ادھر لانے کا کام یہ شعیب کا ہے۔ جو موسیٰ علیہ السلام کو کلیم اللہ بنا دیتا ہے۔ اس کے لیے تربیت در تدبیر ہوتی ہے۔

عزیزان گرامی!

یہ صحبت کا معاملہ ہے۔ یہ بہت ضروری ہوتی ہے آخر میں یہ شعر عرض کروں گا۔

وہ تو وہ ہیں تمہیں ہو جائے گی الفت مجھ سے
اک نظر تم میرا محبوب نظر تو دیکھو

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین ـــہ ـــ

ناظرین کرام!

ریٹائرڈ جسٹس نعیم الدین ایک ماہر قانون دان ہونے کے ساتھ ساتھ پاکستان الیکشن کمیشن کے سابق سربراہ کی حمایت سے بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں۔ قانون کی گتھیاں

بھی سلجھاتے ہیں اور علم ادب سے بھی گہرا شغف رکھتے ہیں اور ان کے فروغ میں بھی حصہ لیتے ہیں۔ جس کا واضح سبب ان کی یہاں موجودگی ہے۔ میں نہایت ادب و احترام کے ساتھ آج کے اس تقریب کے مہمان خصوصی ریٹائرڈ جسٹس نعیم الدین کو دعوت خطاب دے رہا ہوں۔ جسٹس نعیم الدین صاحب۔

جسٹس نعیم الدین صاحب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

فضیلت ماب ڈاکٹر غلام مصطفیٰ صاحب، ڈاکٹر نجم الاسلام صاحب، ڈاکٹر احسن فاروقی صاحب، ڈاکٹر غلام مرتضیٰ صاحب اور بزرگو میں آپ سب کا شکر گذار ہوں کہ آپ نے مجھے اس تقریب میں شرکت کی دعوت دی اور سب سے پہلے میں خاور جمیل صاحب کا شکریہ ادا کروں گا کہ انہوں نے یہ تقریب منعقد کی اور اس کے انعقاد کا فیض ہم سب کو حاصل ہوا۔ اور ہم کو پہنچے گا۔ وقت اتنا کم ہے کوئی اتنی بڑی تقریر نہیں کرسکتا ہوں۔ کیونکہ ابھی ڈاکٹر صاحب کو سننا باقی ہے۔ میں صرف ایک دو باتیں کروں گا۔ پہلی بات تو یہ کہ میرا ڈاکٹر صاحب سے تعلق ۱۹۴۹ء میں قائم ہوا۔ جب میں ان کا طالب علم تھا۔ ۱۹۴۹ء سے یہ تعلق آج تک قائم ہے۔ اس میں کبھی بھی اتنی گہرائی نہیں رہی جتنی آپ کے قرب کی وجہ سے ہوتی ہے۔ لیکن آپ سے تعلق برقرار رہا۔ آج میری یہاں موجودگی اس بات کی دلیل ہے کہ میں ڈاکٹر صاحب کو یاد رہا اور مجھے بھولے نہیں۔ اور اس سے زیادہ واسطہ میرا اور ڈاکٹر صاحب سے ہے اور وہ یہ کہ مجھے ساری زندگی ڈاکٹر صاحب سے دعائیں ملتی رہیں اور ان دعاؤں کی بدولت میں نے پایا مجھے جو مقام ملا وہ ان کی بدولت ملا۔ میں نے طے کیا تھا کہ میں ملازمت نہیں کروں گا۔ اس لیے میں وکیل بنا اور وکالت کے پیشے میں بہت کامیاب رہا۔ جج بن گیا اور بعد میں سپریم کورٹ کا جج بن گیا۔ ان تمام سلسلوں میں میری حیثیت ایک سرکاری ملازم کی نہیں تھی۔ اس لیے کہ میں کبھی سرکاری ملازم نہیں رہا۔ ایک اسٹیٹ کا ملازم بنا اور اسٹیٹ کا ملازم بھی ایسا بنا کہ بالکل (Independent) جس کو ہمیشہ مکمل اختیار رہا۔ اس نے جو کام کیا اپنے ایمان کے ساتھ کیا۔ ان سب چیزوں میں جو دخل ہے وہ صرف ڈاکٹر

صاحب کی دعاؤں کا ہے۔ اور کسی چیز کا نہیں۔ کیونکہ ان کے علاوہ مجھے کوئی ایسا گھر نہیں تھا۔ ۱۹۷۷ء کے بعد تو کوئی نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب ہی ہیں جو مجھے دعائیں دیتے رہے۔ اور آج تک ان کی دعائیں میرے شامل حال ہیں۔ دوسری بات جو میں عرض کروں گا وہ ابھی تھوڑے عرصے پہلے کی ہے کہ ایک روز میں ایئرپورٹ پر وی آئی پی لاؤنج میں بیٹھا ہوا تھا تو خاور جمیل اس روز وہیں تھے۔ میں نے اپنے پروٹوکول آفیسر سے کہا کہ دیکھو کہیں اس گوشے میں ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب تو نہیں بیٹھے ہیں۔ کیونکہ مجھے ان کی جھلک نظر آئی۔ انہوں نے جا کے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب بیٹھے ہیں۔ پھر میں اٹھ کر ان کے پاس گیا۔ میں نے ان کو سلام کیا اور سلام کرنے کے بعد میں نے کہا ڈاکٹر صاحب آپ کو مبارک ہو آپ کو اعزاز مل رہا ہے۔ تو آپ کو معلوم ہے انہوں نے بے ساختہ کیا کہا۔ کہ اب وہاں کے اعزاز کی ضرورت ہے (یعنی آخرت کی) یہاں کی نہیں۔

تو مجھے....... اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں نے سندھ زکوۃ کونسل کے چیئرمین کی حیثیت سے ۹ سال کام کیا۔ میں نے ۹ صفحے کی صوبے کی رپورٹیں لکھیں اور کسی صوبے کی کوئی رپورٹ نہیں۔ دوسرے میں نے ٹیکسٹائل کمیشن میں بطور چیئرمین کام کیا۔ اور ۹ ساڑھے نو صفحات کی رپورٹ لکھی۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کے کہنے کے بعد یہ خیال نکل گیا کہ مجھے بھی اعزاز ملنا چاہیے۔ میں نے کہا مجھے کسی اعزاز کی ضرورت نہیں کیونکہ ڈاکٹر صاحب نے جو یہ فرمایا ہے وہ بہت بڑی بات ہے اور میرے دل سے یہ خیال نکل گیا میرا خیال ہے۔ میں اسی پر اپنی بات ختم کرتا ہوں اور امید ہے ڈاکٹر صاحب کی آپ تقریر سنیں گے۔ بہت بہت شکریہ۔

اب اس تقریب کے مہمان خصوصی جن کے لیے یہ محفل سجائی گئی ہے۔ حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب دامت برکاتہ اپنے خیالات کا اظہار فرمائیں گے۔

حضرت ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب دامت برکاتہ

الحمدللہ و کفیٰ وسلامٌ علیٰ عبادہ الّذین اصطفیٰ

صدر والا مرتبت اور حاضرین با تمکین!

میں آج اپنے قریب ترین عزیزوں اور محسنوں کے درمیان گھرا ہوا ہوں۔ اور اس

موقع پر اللہ تعالیٰ کا جس قدر شکر ادا کروں، کم ہے۔

سب سے پہلے میں اپنے اس عزیز کا ذکر کروں گا جس کو اللہ تعالیٰ نے تین مرتبہ گورنر بنایا۔ ان کے دوسرے اعلیٰ عہدوں کا ذکر نہیں کروں گا کہ آپ انہیں فوراً نہ پہچان لیں۔ ۱۹۴۸ء میں جب کراچی میں اسلامیہ کالج قائم ہوا تو یہ عزیز بی اے کے طالب علم تھے۔ قریب ڈیڑھ سال کے بعد اس کالج کے پرنسپل اور سیکریٹری کے درمیان نزاع قائم ہوا۔ پرنسپل نے سب اساتذہ کا بائیکاٹ کرا دیا۔ اور سب سے استعفا دلوا دیا۔ وہ ہر روز کوئی نہ کوئی تحریر سیکریٹری کے نام لکھواتے تھے اور سب اساتذہ کے دستخط کرا دیتے تھے۔ استعفا نامہ پر بھی سب سے دستخط کرائے۔ میں نے بغیر پڑھے ہوئے اس پر دستخط کر دیے۔ سیکریٹری کو جب معلوم ہوا کہ میں نے بغیر پڑھے ہوئے اس پر دستخط کیے تھے تو وہ گھر پر آئے۔ لیکن پھر میں نے رجوع نہیں کیا۔ اس عزیز کو معلوم ہوا تو ایک رقم لے کر آئے اور اصرار کیا کہ میں قبول کر لوں تاکہ بچوں کا گذارہ ہو سکے۔ میں نے رقم تو قبول نہیں کی لیکن ان کے لیے ہمیشہ دعا کرتا ہوں اور انہوں نے کبھی نیاز مندی میں فرق نہیں آنے دیا۔

دوسری عظیم شخصیت ڈاکٹر جمیل جالبی صاحب کی ہے۔ ان کی علمی، ادبی، حسبی و نسبی وجاہت سے کون واقف نہیں؟ انہوں نے ۱۹۴۸ء سے اب تک جس خلوص اور محبت کا تعلق رکھا ہوا ہے وہ انہی کے زیب دیتا ہے۔ وہ میرے بیٹے سراج احمد سے کہا کرتے ہیں کہ "سراج احمد تم یہ نہ سمجھنا کہ تم ہی ان کے بیٹے ہو، میں بھی ان کا بیٹا ہوں۔" یہ جملہ میں کس طرح بھول سکتا ہوں؟ اس پیارے عزیز کے پیارے بیٹے ڈاکٹر خاور جمیل ہیں جنہوں نے انتہائی جوشِ محبت میں آج کا جلسہ منعقد کیا ہے اور ان کے تعلق کا ایک ایک لمحہ انتہائی خلوص کی داستان ہے۔ پھر عزیز گرامی منزلت ڈاکٹر اسلم فرخی ہیں جو مجھ سے اور میرے بچوں سے اس قدر قریب ہیں کہ لوگوں کو رشک آتا ہے اور ان کے عزیزوں نے بھی مجھے ہمیشہ اپنا سمجھا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے متعلق جو کچھ لکھا ہے، جب کبھی لکھا ہے وہ اہل علم حضرات سے پوشیدہ نہیں۔ ان کے علاوہ ایک نہایت فاضل اور سنجیدہ محقق ڈاکٹر نجم الاسلام ہیں جن پر مجھے بجا طور پر فخر ہے۔ ان کے مجھ پر بکثرت احسانات ہیں جن کا ذکر کرنا خود ان کو پسند نہ ہوگا، اس لیے عرض نہیں کر سکتا۔ پھر عزیز نامور ڈاکٹر غلام مرتضیٰ ملک ہیں۔ جنہوں

نے اس ناچیز کو بارہا اپنی محبت و عقیدت سے اس طرح نوازا ہے اور نوازتے ہیں کہ مجھے شرم آتی ہے۔ سعید رحمانی صاحب بھی اپنے اعلیٰ عہدے کے باوجود میرے لیے تواضع و انکسار کا ایک ایسا نمونہ ہیں جس کی مثال شاذ ہے۔ پھر نذرالحسن صدیقی کے حسن انتظام کا شکریہ ادا کرنا بھی میرے لیے موجب ابتہاج و افتخار ہے۔ اور یہ تشکر نامہ گو کہ طویل ہو گیا ہے لیکن ایک حدیث ہے کہ "من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ" تو پھر یہ طوالت کیونکر موجب رحمت نہ ہوگی۔

عزیزو' آج مسلمان کے خون کی ارزانی ہے لیکن بڑے اور چھوٹے سب خاموشی سے تماشا دیکھ رہے ہیں۔ سورۃ النساء (۹۳) میں ارشاد ہے۔ "اور جو کوئی قتل کرے مسلمان کو جان کر تو اس کی سزا جہنم ہے' اسی میں ہمیشہ رہے گا اور اللہ کا اس پر غضب ہوگا اور اس کو لعنت کی اور اس کے واسطے تیار کیا عذاب عظیم۔" لیڈر صاحبان شاید اس لیے خاموش ہیں کہ فی الحال کوئی الیکشن تو نہیں ہوگا کہ عوام کے لیے اخلاص کی نمائش کی جائے اور عوام شاید اس لیے خاموش ہیں کہ اگر مرنا ہی مقدر ہے تو صبر کے ساتھ مرتے رہنا ہی بہتر ہے۔ لیکن ہمیں یاد رکھنا چاہیے کہ " ان بطش ربک لشدید "۔ اللہ تعالیٰ کی پکڑ بہت سخت ہے۔ ایک حدیث ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم نے فرمایا' قیامت کے قریب چند چیزیں پھیل جائیں گی۔ (۱) خواص سے سلام (یعنی عوام کی پروا نہ کی جائے گی۔ (۲) کاروباری معاملات کا پھیلاؤ' یہاں تک کہ اس کام میں عورت بھی اپنے شوہر کی معاونت کرے گی۔ (۳) قطع رحمی (عزیزوں سے بے تعلقی) (۴) تعلیمی ترقی اور علم کا پھیلاؤ (غیر ضروری علوم کا پھیلاؤ (۵) جھوٹی شہادت عام ہوگی۔ لوگ سچی گواہی دینے سے گریز کریں گے۔

میرے عزیزو! یہ باتیں کہنے کی تو نہیں ہیں لیکن دل روتا ہے' اس لیے کہ اپنوں سے نہ کہوں تو کس سے کہوں؟ واقعی ہمارے کرتوت ایسے ہیں کہ دعا مانگنے میں بھی شرم آتی ہے۔ تاہم وہ ارحم الراحمین ہے اور اس کی رحمت سے مایوس نہ ہونا چاہیے۔

اب میں قرآن و حدیث کی روشنی میں چند باتیں عام فائدے کے لیے عرض کرنے کی جرات کروں گا۔

(۱) عشاء کے فوراً" بعد اگر ہم سوجایا کریں تو بہت سی آفتوں سے محفوظ رہ سکتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم عشاء کے بعد کسی سے بات بھی نہیں کرتے تھے۔ اگر تہجد نصیب ہو جائے تو بہت بڑی خوش نصیبی ہے' تہجد کی نماز میں لمبا قیام' لمبا رکوع اور لمبا سجود ممکن نہ ہو تو تھوڑا ہی کافی ہے۔ لیکن پھر تھوڑی دیر ورزش ضرور کرلیا کریں اور اس وقت قرآن پاک کی تلاوت (خواہ تھوڑی ہی ہو) دل اور آنکھوں کی روشنی کو بڑھاتی ہے اور اگر اسے زیادہ پڑھیں گے تو وہ آپ سے باتیں کرنے لگتا ہے اور ہر موقعے پر آپ کی رہنمائی کرتا ہے۔

(۲) کھانا ہمیشہ بغیر گھی تیل کا ہو' یعنی ابلا ہوا کھانا بہت مفید ہے۔ حدیث شریف میں ہے کہ معدہ کے تین حصے کرو' ایک کھانے کے لیے' ایک پانی کے لیے اور ایک ہوا کے لیے۔ یعنی معدہ کا صرف ایک حصہ کھانے کے لیے مختص کریں کہ

ے خوردن برائے زیستن وذکر کردن است

البتہ اگر روغن زیتون میسر آجائے تو اس کا استعمال بے حد مفید ہے۔

(۳) مسواک ضرور کیا کریں۔ اس سے دانت بہت مضبوط ہو جاتے ہیں۔ مجھے ۸۴۔ ۸۵ سال کے بعد مصنوعی دانتوں کی ضرورت محسوس ہوئی ہے۔ ٹوتھ برش ہرگز استعمال نہ کریں۔ اس سے دانت کھوکھلے ہو جاتے ہیں۔

(۴) ہر بیماری کے لیے شہد اور کلونجی بے حد مفید ہے۔ میں نے ایک خاتون کو جن کے پیر میں گینگرین کی سخت تکلیف تھی شہد لگانے کا مشورہ دیا تو بفضلہ تعالیٰ وہ تین ہفتوں میں شفایاب ہو گئیں۔

(۵) پڑوسی کو بالکل اپنا عزیز سمجھیں اور ہر شخص کی خدمت کو اپنا فرض سمجھیں۔

(۶) محبت سے دشمن کے دل کو بھی جیت سکتے ہیں۔ وہ لاکھ دشمنی کرے لیکن ہم ہمیشہ اس کے ساتھ بھلائی کریں۔ یہ ایسا نسخہ ہے جو سیاسی مخالفوں کے دلوں کو جیتنے کے لیے بھی اکسیر ہے۔

(۷) بچوں کے اخلاق ٹی وی اور وی سی آر وغیرہ سے خراب کرائے جا رہے ہیں۔ غیبت'

عیب جوئی اور خودنمائی کی بیماریاں عام کرائی جارہی ہیں۔ ہم آپ کا فرض ہے کہ بچوں کو ان عیوب سے بچائیں۔

(۸) بچوں کو نہ ہرگز ڈانٹیں اور نہ ماریں۔ شفقت اور پیار سے ان کی اصلاح کریں اور خوب ہمت افزائی کریں تاکہ ان کی خفتہ صلاحیتیں بیدار ہوسکیں۔ زعفران (شکر کے ساتھ) نہار منہ کھلانا حافظے کے لیے اکسیر ہے۔ روح و ریحان (سورۃ الواقعہ ۸۹) عقبیٰ کے لیے تو ہے لیکن اس دنیا میں بھی اس کا پرتو ہونا چاہیے۔ پاک خوشبو (یعنی عطر) کے استعمال سے بھی بچوں کا ذہن تیز ہوتا ہے۔ ناپاک خوشبو (یعنی سینٹ) ہرگز استعمال نہ کرائیں۔ حضرت مظہرجان جاناں (م ۱۱۹۵ھ) نے کیا خوب فرمایا ہے۔

مزاج عشق نازک تر زحسن است ترا رنگ و مرا بو آفریدند

(۹) شرعی حدود کے مطابق بیویوں کے حقوق ادا کریں اور جلابیب کا استعمال ضرور کرائیں۔ (یعنی لٹکتی ہوئی چادریں) بیویاں بھی شوہروں کے شرعی حقوق کو ملحوظ رکھیں۔

(۱۰) اور سب سے مقدم اور سب سے موخر صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت ہی کو اپنی زندگی سمجھیں۔ کیونکہ

؎ نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

اور حضرت مجدد الف ثانی رحمتہ اللہ علیہ قدس سرہ فرماتے ہیں کہ ''لا الہ الا اللہ کے معنی صرف خدا کے سامنے جھکنا ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معنی صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی پیروی کرنا ہے۔ جب تک یہ دو باتیں نہ ہوں تو گویا ہم نے کلمہ ہی نہیں پڑھا۔'' بہت بہت شکریہ!

از

حضرت مولانا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ

الٰہی

کئی گناہوں میں عمر ساری الٰہی توبہ الٰہی توبہ
نہ ہو سکی کچھ وفا شعاری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

خطا شعاری، گناہ گاری، سیاہ کاری، تباہ کاری
یہی ہے بس داستاں ہماری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

نہ ہم کو آیا خیال عقبیٰ، مال دنیا نہ یاد آیا
جو پائی آدھی تو کھوئی ساری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

نہ چھوڑی دنیا کی چاہ ہم نے، یہ عمر کردی تباہ ہم نے
نہ ہو سکی اس سے رستگاری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

خدا خدا کرکے زندگی کی، خدا خدا بھی نہ کرسکے کچھ
یہ کیسی دنیا؟ فریب کاری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

رکھے ہیں ہم نے تو نام اچھے مگر نہیں کام اچھے
بروں ہی کے حق میں رب ہے باری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

نجی آقا ہو فضل جاری تو ساری امت پہ باری باری
رہے گا عقبیٰ میں لطف باری الٰہی توبہ الٰہی توبہ

ادارہ علمی مخزن کے اغراض و مقاصد

جامع شریعت و طریقت ، رئیس المحققین

حضرت مولانا پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب مدظلہ

کی

(۱) ہر قسم کی تقاریر مبارک اور ملفوظات شریف کو جمع کرنا۔

(۲) ہر قسم کی نایاب تحریر مبارک (تصانیف ، مقالات ، مقدمات ، اور مکتوبات مبارکہ وغیرہ کو جمع کرنا

(۳) جن حضرات نے جہاں جہاں حضرت مولانا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب مدظلہ کے لیے جس شکل میں بھی جو کچھ فرمایا ہے اسے جمع کرنا۔

گزارش

جن حضرات کے پاس حضرت مولانا ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان صاحب مدظلہ کی کوئی تحریر (حضرت صاحب کی یا حضرت صاحب کے لیے)، کیسٹ اور مکتوبات مبارکہ ہوں تو وہ ہمیں فوٹو کاپی قیمتاً دے دیں یا مطلع فرمائیں ، تمام اخراجات ادارہ خود برداشت کرے گا۔

رابطے کے لیے۔ فون : ۶۴۴۹۱۸ ، ۶۳۳۰۹۱۹ ، ۶۶۹۱۶۲۹ ، ۶۶۶۶۰۶۹

ادارہ علمی مخزن

ایل ۔ ۷۰۸ ۔ ۵ ۔ سی/۲ ، نارتھ کراچی